GOODOLDKARACHI.COM
WWW.THEDOWDAYS.COM

سلور جوبلی نمبر

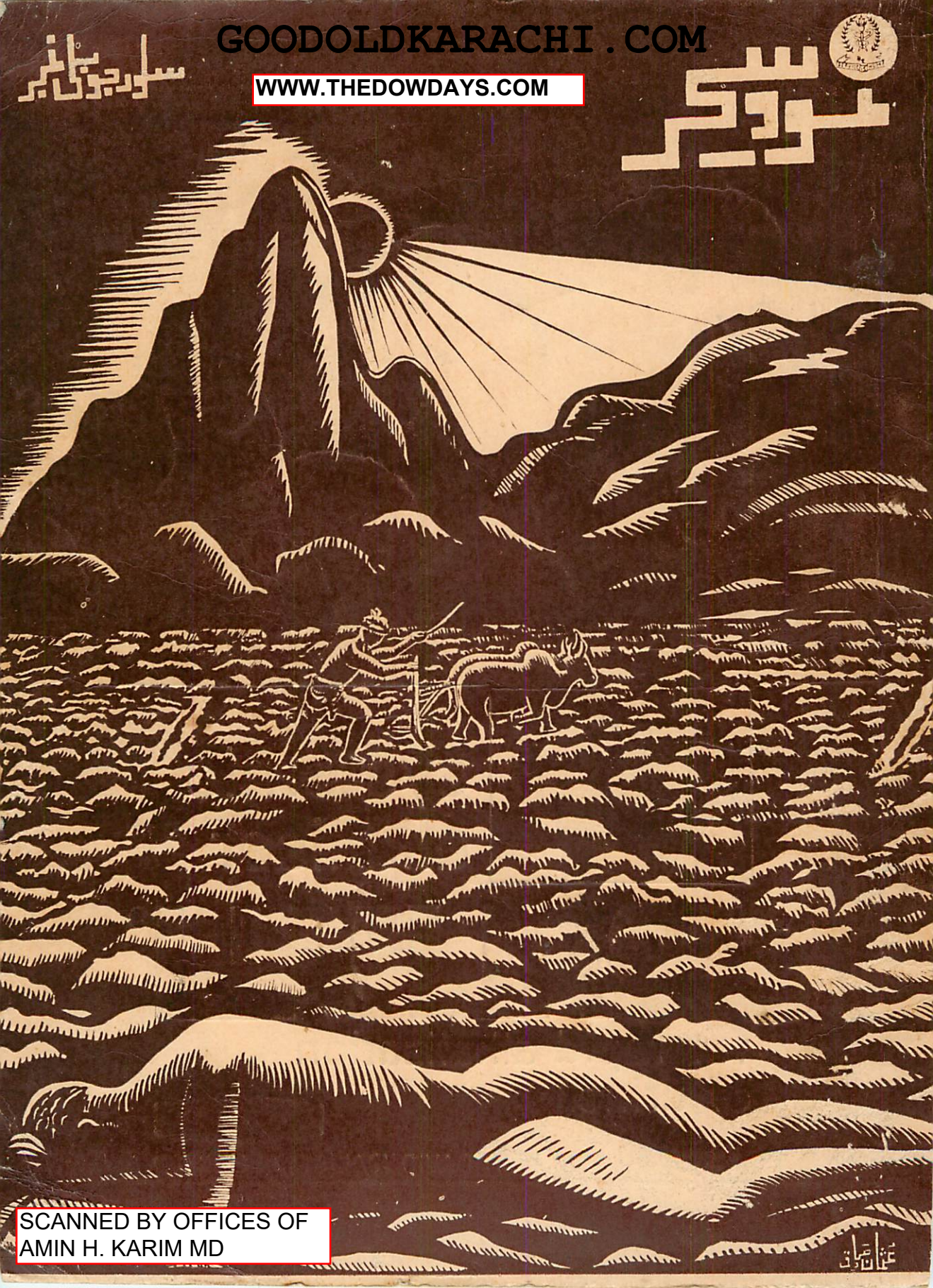

SCANNED BY OFFICES OF
AMIN H. KARIM MD

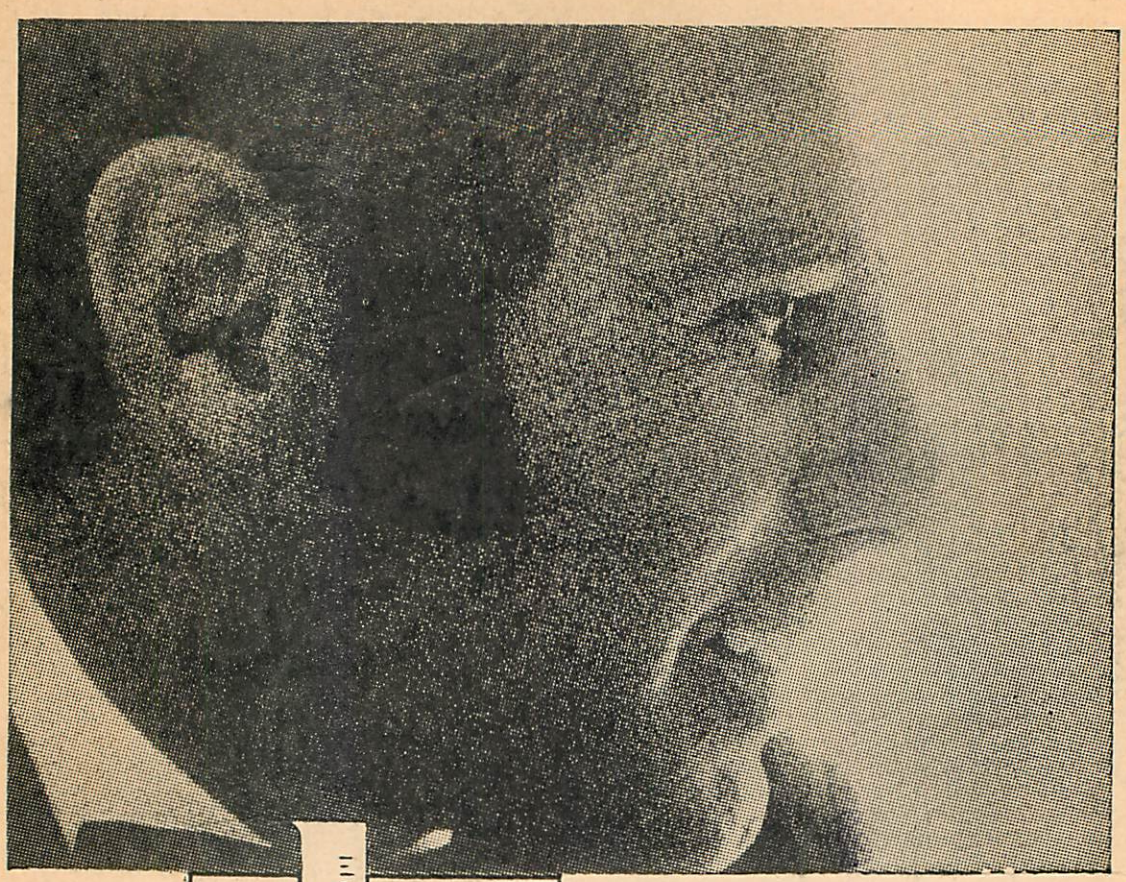

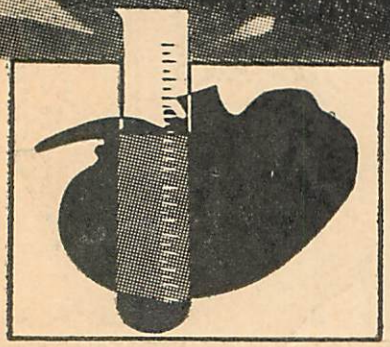

systemic
alkaliser

SIOALKALI®

for rapid alkalization
of urine

Albert David

ALBERT DAVID (PAKISTAN) LIMITED

بسم الله الرحمن الرحيم
عثمان طه

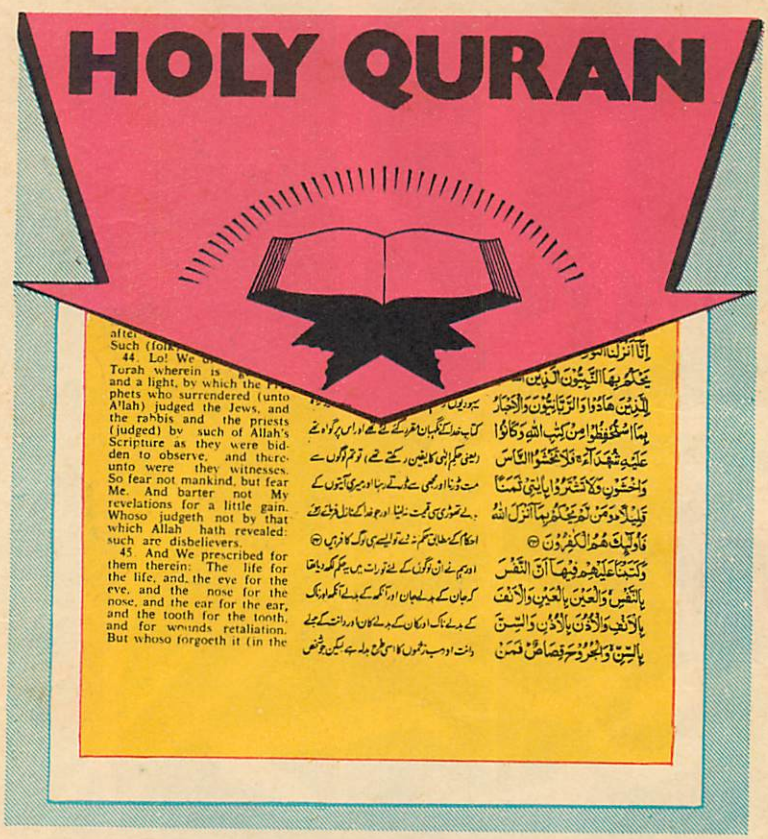

A unique volume for better understanding of the Holy Quran - Arabic with Urdu and English translations side by side.

Send for free sample pages to:

TAJ COMPANY LTD

P.O. BOX 530, KARACHI

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝

شعور

سلور جوبلی نمبر ۳۵-۳۶ — ۷۰-۷۱

سرپرست

پروفیسر عبدالوحید

چیئرمین

پروفیسر فضلِ الٰہی

میگزین سیکریٹری

ہاشم شریعت

مدیرِ اعلیٰ

صداقت علی چوہدری

آرٹسٹ

عثمان صادق بلوچ

انجمنِ اتحادِ طلبہ ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی

بسم الله الرحمن الرحيم
وقولوا للناس حسنا
فقد استمسك بالعروة الوثقى
البقرة ٢٦٩

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے

جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

اور جسے حکمت عطا کی گئی

پس خیر کثیر دیا گیا۔

تاج کمپنی کے انمول ہیرے

۱۔ **قرآن مجید** مع ترجمہ مولانا محمود الحسن صاحب۔ حاشیہ پر تفسیر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی
بڑی تقطیع، عکسی طباعت دورنگہ

۲۔ **قرآن مجید** مع ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی۔ حاشیہ پر مکمل تفسیر بیان القرآن
بے نظیر تفسیر اور بے نظیر خوبصورت عکسی طباعت

۳۔ **قرآن مجید** مع ترجمہ از شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی۔ حاشیہ پر تفسیر موضح القرآن
بینظیر لفظی ترجمہ۔ دیدہ زیب عکسی طباعت

۴۔ **قرآن مجید** مع ترجمہ از شاہ عبد القادر صاحب محدث دہلوی۔ حاشیہ پر تفسیر موضح القرآن
شاہ عبد القادر کا ترجمہ اور تاج کمپنی کی طباعت سونے پر سہاگہ ہے

۵۔ **قرآن مجید** مع ترجمہ از مولانا فتح محمد خاں صاحب جالندھری۔

۶۔ **قرآن مجید** مع ترجمہ از مولانا اشرف علی صاحب تھانوی۔ حاشیہ پر تفسیر بیان القرآن اختصار شدہ

۷۔ **قرآن مجید** مع ترجمہ از مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی۔ حاشیہ پر مکمل تفسیر ماجدی
تعلیم یافتہ طبقہ کیلئے ایک بے بہا تحفہ

۸۔ **قرآن مجید** مع ترجمہ انگریزی۔ از مسٹر مارماڈیوک پکتھال۔ کتابی تقطیع، بہت آسان صاف انگریزی ترجمہ

۹۔ **قرآن مجید** چھ اردو ترجموں کے ساتھ۔ حاشیہ پر تفسیر عثمانی و تفسیر موضح القرآن
دنیا بھر میں ایک نئی چیز بڑی تقطیع

مکمل فہرست مفت طلب کریں!

۱۰۔ **قرآن مجید** مع انگریزی ترجمہ و تفسیر از مولانا عبد الماجد دریابادی۔
انگریزی جاننے والے کہتے ہیں یہ ترجمہ و تفسیر بے نظیر ہے۔

۱۱۔ **قرآن مجید** مع ترجمہ اردو و انگریزی یکجا۔ از مولانا فتح محمد خاں و مسٹر مارماڈیوک پکتھال۔

۱۲۔ **قرآن مجید** ۔ بلا ترجمہ۔ چھوٹی تقطیع سے لیکر بڑی تقطیع تک سینکڑوں اقسام عکسی طباعت

۱۳۔ پنجسورے، یازدہ سورے، اوراد، دعائیں۔ دلائل الخیرات۔ مناجات مقبول، نشر الطیب اور
دیگر بے شمار اسلامی، مذہبی مطبوعات۔ عورتوں اور بچوں کے لئے اعلیٰ ترین لٹریچر

تاج کمپنی لمیٹڈ۔ قرآن منزل، پوسٹ بکس ۵۳۰ کراچی

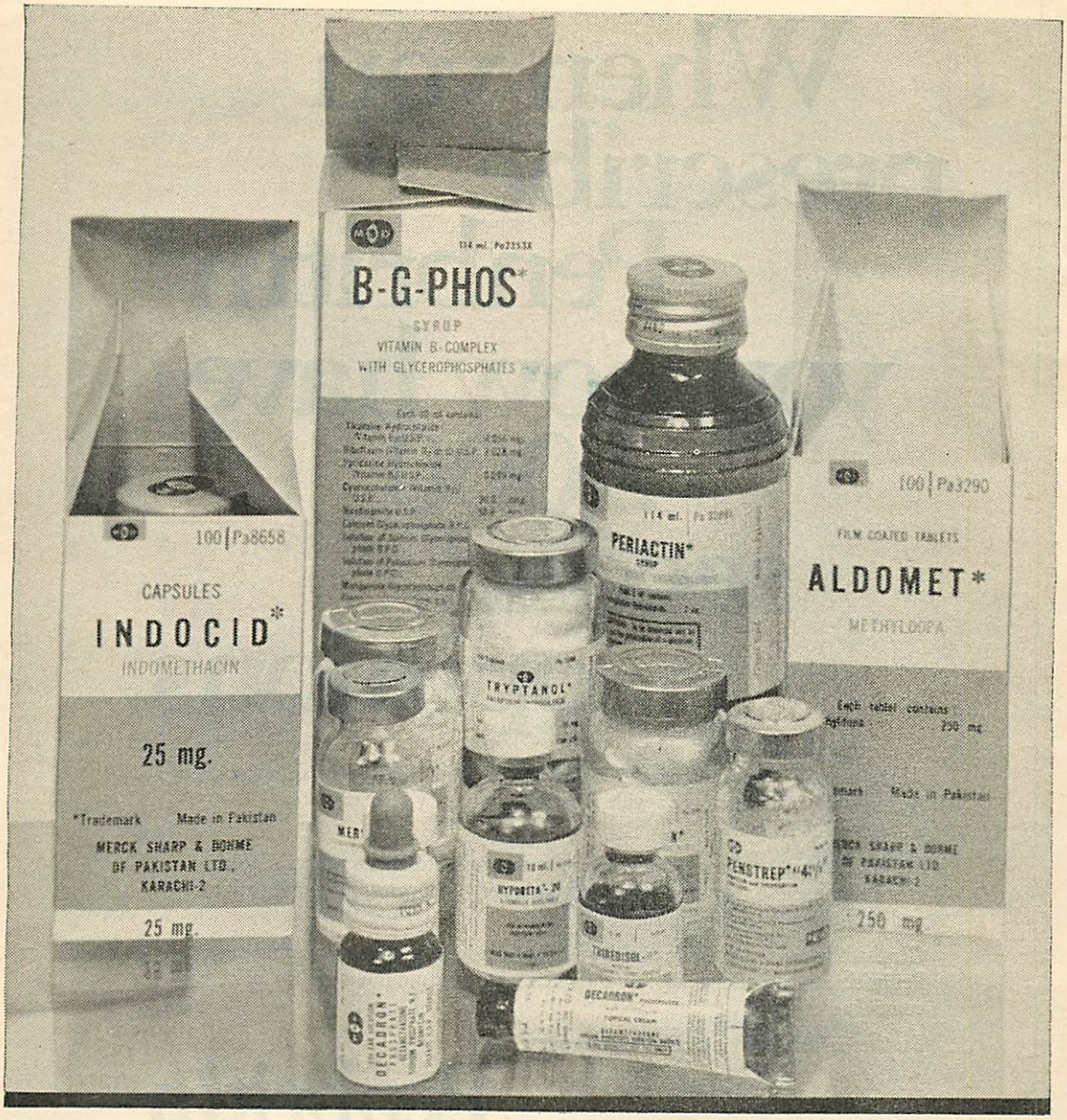

MSD MERCK SHARP & DOHME OF PAKISTAN LTD.

where today's research is tomorrow's therapy

When you prescribe Penbritin you now have 2,000 second opinions

There are now 2,000 references relating to Penbritin. They show an unequalled record of effectiveness over a wide range of respiratory, urinary tract and other infections.

Penbritin is one of the safest broad-spectrum antibiotics currently available. It is being used to treat the young and the elderly, neonates, pregnant patients and even those in renal failure.

Continually rising demand, world-wide, has made it possible to manufacture Penbritin more economically. As the references have mounted up, the price has come down.

Further information is available on request.

Penbritin

Penbritin* (ampicillin B.P.) is a product of research at
Beecham Research Laboratories Brentford, England
originators of the new penicillins.
Beecham (Pakistan) Limited P.O. Box 2802 Karachi No. 1

*regd.

P/PAK/P/3/70

ASIATIC

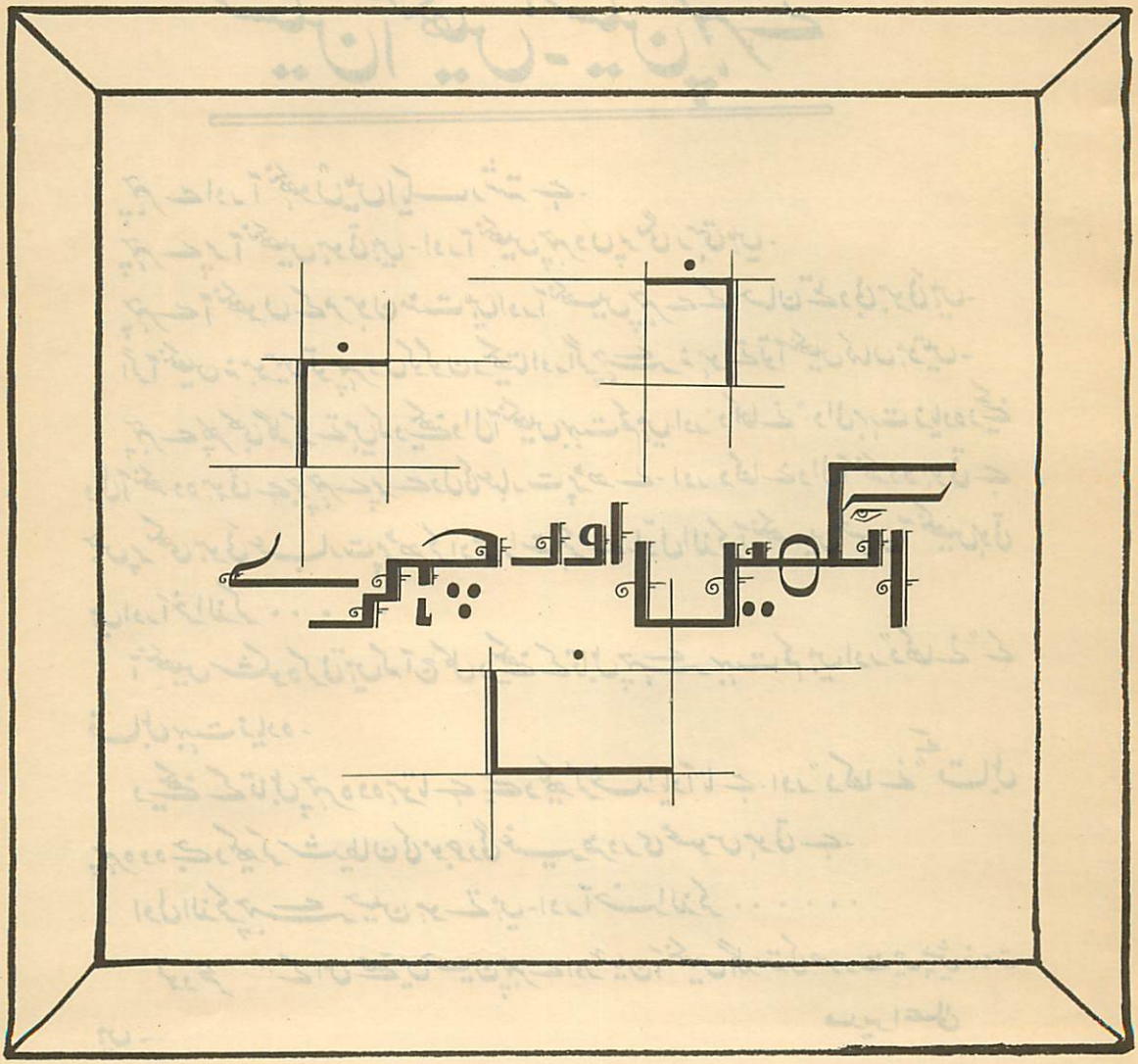

حسین آنکھیں، حسین چہرے

چہرے اور آنکھوں میں ایک رشتہ ہے۔
چہرے پر آنکھیں ہوتی ہیں۔ اور آنکھیں چہروں پر لگی رہتی ہیں۔
چہرے آنکھوں کے مرہون منت ہیں اور آنکھیں چہرے کے احسان تلے دبی ہوئی ہیں۔
اگر آنکھیں نہ ہوتیں تو چہروں کو کون دیکھتا اور اگر چہرے نہ ہوتے تو آنکھیں کہاں ہوتیں۔
چہرے پھر بھی گلہ کرتے ہیں کہ دیکھنے والی آنکھیں بہت کم ہیں۔ اور "دکھانے" والی بہت زیادہ دیکھنے والی آنکھ وہ ہوتی ہے جو چہرے پر سے دل کی عبارت پڑھ لے۔ اور دکھانے والی آنکھ وہ ہوتی ہے جس پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر آدمی راستہ پکڑ لے۔ اوّل الذکر آنکھیں حسین آنکھیں ہوتی ہیں اور آخر الذکر . . . . .
آنکھیں شکوہ کرتی ہیں کہ آج کل دیکھنے کے قابل چہرے بہت کم ہیں اور "دکھانے" کے قابل بہت زیادہ۔
دیکھنے کے قابل چہرہ وہ ہوتا ہے جسے دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ اور "دکھانے" کے قابل چہرہ وہ جسے دیکھ کر شیطان کی موجودگی غیر ضروری محسوس ہوتی ہے۔
اول الذکر چہرے حسین ہوتے ہیں۔ اور آخر الذکر . . . . . .
"نمود سحر" کے اس حصے میں حسین چہرے اور حسین آنکھیں گلدستہ کی صورت میں پیش خدمت ہیں۔

مدیر اعلیٰ

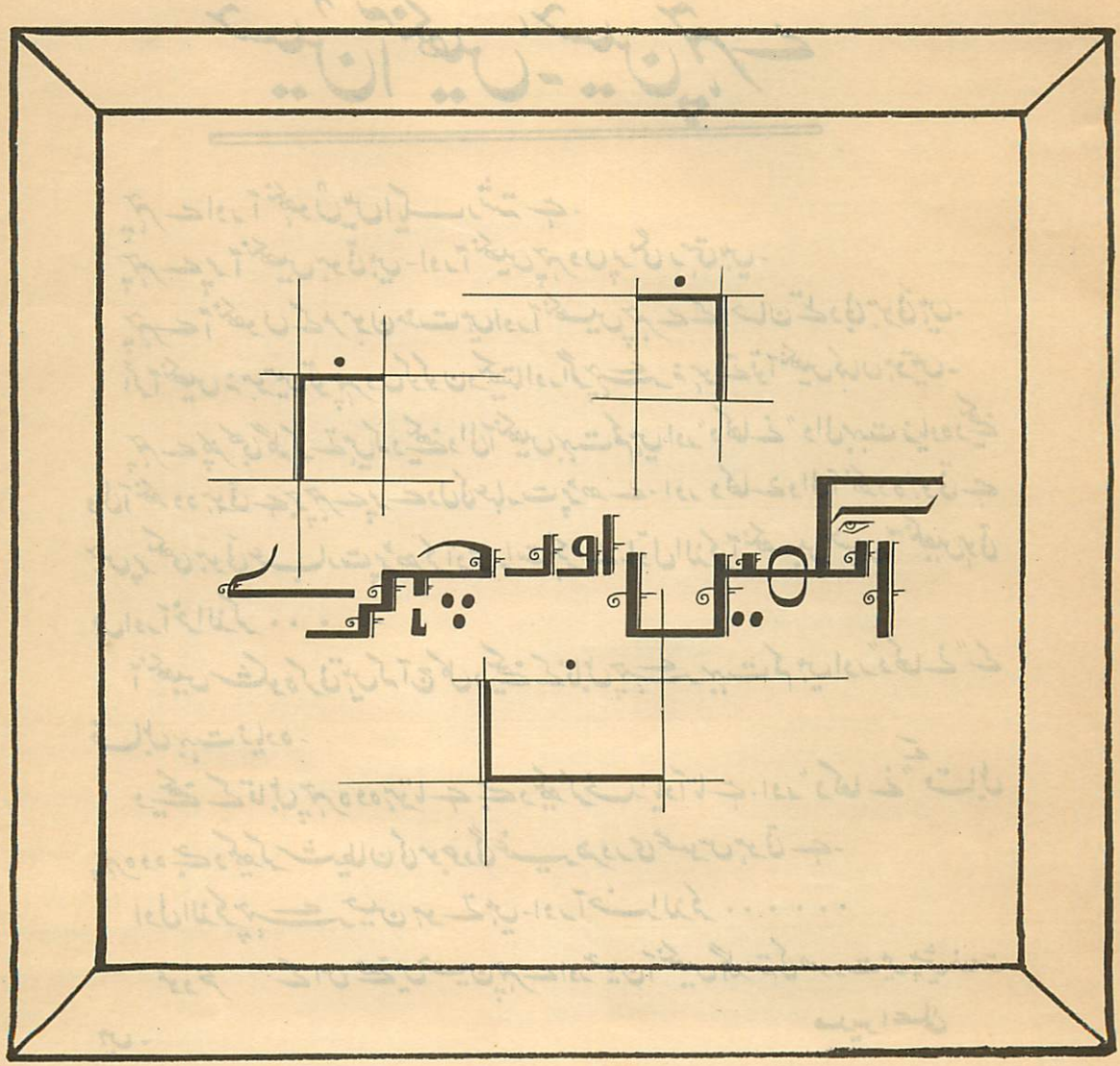

حسین آنکھیں۔ حسین چہرے

چہرے اور آنکھوں میں ایک رشتہ ہے۔
چہرے پر آنکھیں ہوتی ہیں۔ اور آنکھیں چہروں پر لگی رہتی ہیں۔
چہرے آنکھوں کے مرہونِ منت ہیں اور آنکھیں چہرے کے احسان تلے دبی ہوئی ہیں۔
اگر آنکھیں نہ ہوتیں تو چہروں کو کون دیکھتا اور اگر چہرے نہ ہوتے تو آنکھیں کہاں ہوتیں۔

چہرے پھر بھی گلہ کرتے ہیں کہ دیکھنے والی آنکھیں بہت کم ہیں۔ اور "دکھانے" والی بہت زیادہ دیکھنے والی آنکھ وہ ہوتی ہے جو چہرے پر سے دل کی عبارت پڑھ لے۔ اور دکھانے والی آنکھ وہ ہوتی ہے جس پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر آدمی راستہ پکڑ لے۔ اوّل الذکر آنکھیں حسین آنکھیں ہوتی ہیں اور آخر الذکر ......

آنکھیں شکوہ کرتی ہیں کہ آج کل دیکھنے کے قابل چہرے بہت کم ہیں اور "دکھانے" کے قابل بہت زیادہ۔

دیکھنے کے قابل چہرہ وہ ہوتا ہے جسے دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ اور "دکھانے کے" قابل چہرہ وہ جسے دیکھ کر شیطان کی موجودگی غیر ضروری محسوس ہوتی ہے۔

اول الذکر چہرے حسین ہوتے ہیں۔ اور آخر الذکر ......

"نمود سحر" کے اس حصے میں حسین چہرے اور حسین آنکھیں گلدستہ کی صورت میں پیش خدمت ہیں۔

مدیر اعلیٰ

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مجلس ادارت

مدیران معاون

جمیلہ فردوس

سکندر جہاں

معاون حصہ نظم

امین وقار

سرورق انچارج

نعیم احمد زبیر

اراکین مجلس

سید سجاد جاوید احمد

رانا امان اللہ خاں

طارق ظہور

آنسہ انجم آرا رمنظر

آنسہ صبیحہ قاضی

عابد نثار

معاون آرٹسٹ

ناصر محمود

بابائے قوم

حضرت قائداعظم محمد علی جناح

سرپرست

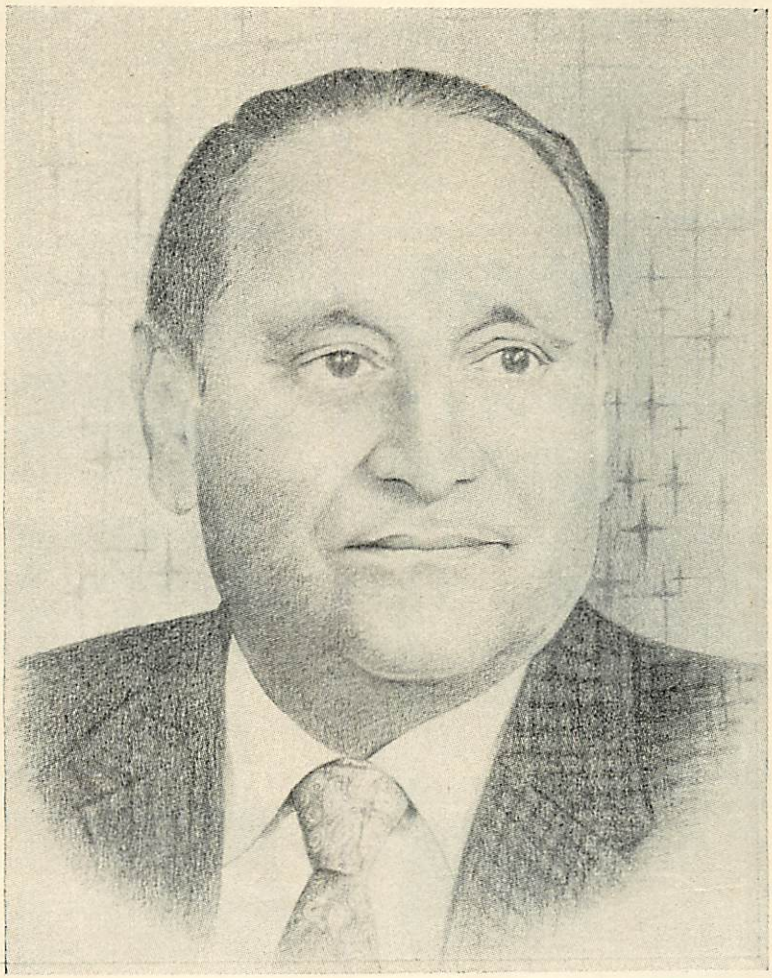

پروفیسر عبدالوحید

SCANNED BY
OFFICES OF
AMIN H. KARIM
MD

چیئرمین

پروفیسر فضل الٰہی

ہاشم شریعت

میگزین سیکرٹری

مدیر اعلیٰ

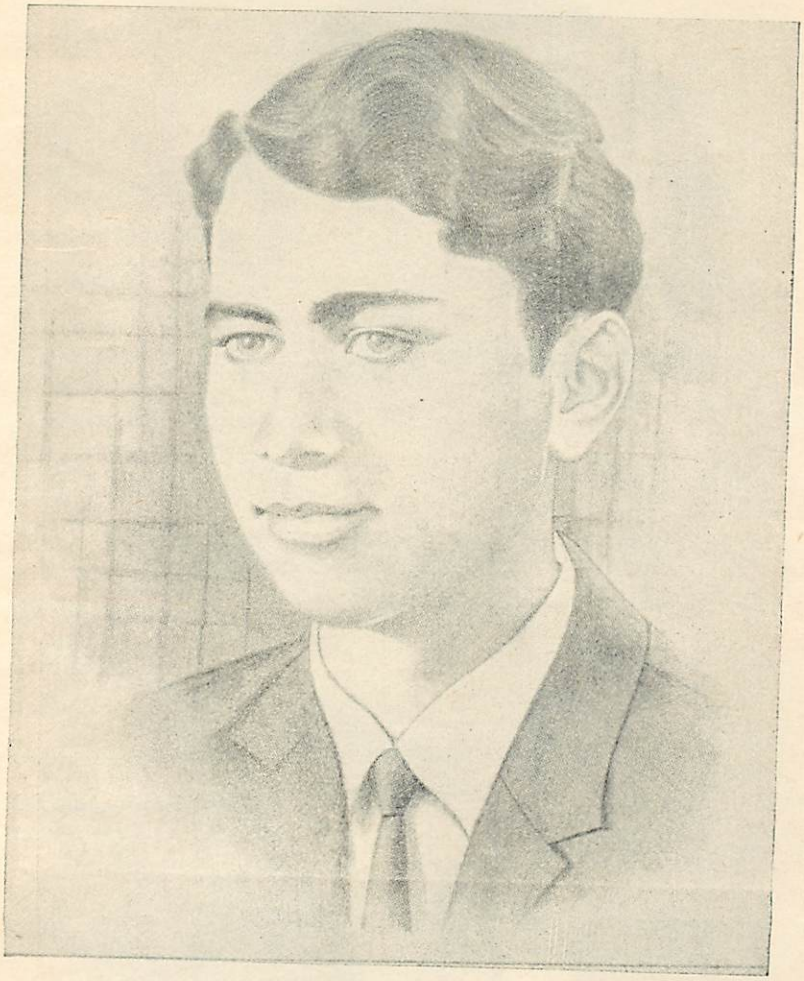

صداقت علی چوہدری

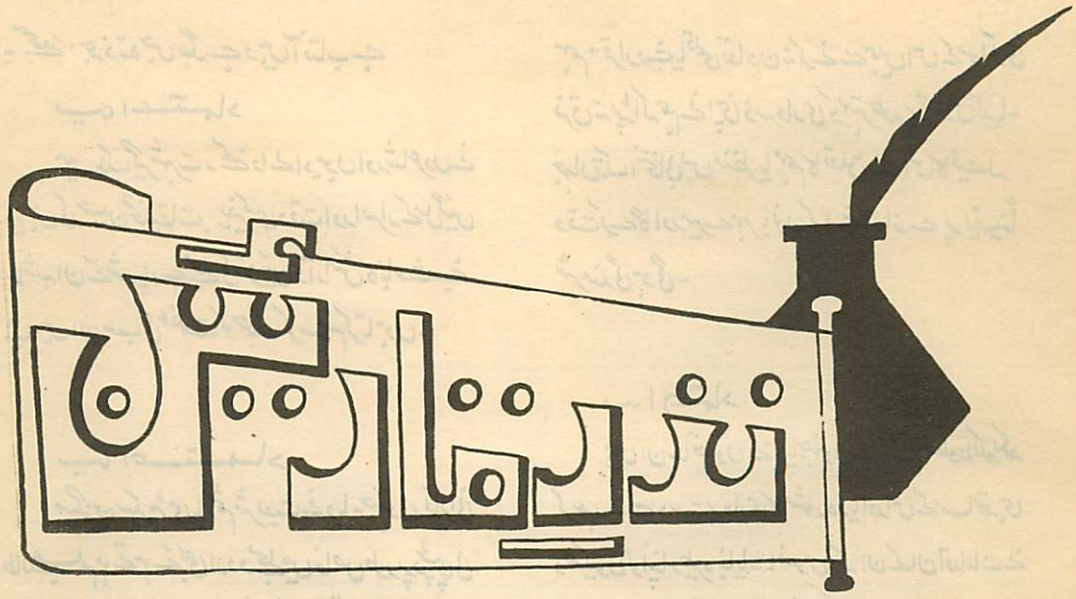

ڈاؤمیڈیکل کالج کے علمی و ادبی مجلّے "نمودِ سحر" کا سلور جوبلی نمبر حاضرِ خدمت ہے۔ اس مجلے کے آپ کے ہاتھوں میں پہنچنے تک اس قدر ہاتھوں نے میرے ساتھ تعاون کیا کہ تعاون نہ کرنے والوں کی میں شدت سے کمی محسوس کرتا ہوں۔ دراصل ان کا وجود بھی ناگزیر ہے۔ تعاون کا احساس اُسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ تعاون کا فقدان بھی اپنی خاص شکل میں موجود ہو۔ اس لحاظ سے زیادہ شکر گزار میں انہی حضرات کا ہوں۔

"نمودِ سحر" کی تیاری میں مضامین حاصل کرنے سے لے کر کتابت تک اور اشتہارات حاصل کرنے سے لے کر طباعت تک مجھے اتنی زیادہ دقت کبھی پیش نہیں آئی کہ اسے مشکل کا نام دیا جاسکے

اب "نمودِ سحر" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
آپ ہی اس کے قاری ہیں اور آپ ہی قلمکار

ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے یہ ضرور سوچ لیجئے گا کہ
اگر آپ "نمودِ سحر" کے قلم کار ہیں تو
آپ کا وزن کس پلڑے میں ہے؟
اگر آپ نے قلمی تعاون نہیں کیا تو
اس کی خامیوں کی وجہ کہیں آپ کی عدم دلچسپی تو نہیں؟۔
پھر بھی تنقید کرتے وقت قلم سے پہرے ہٹا لیجئے گا۔

ہمیں اپنی پسند و ناپسند سے ضرور آگاہ کیجئے۔

کیونکہ ہم یہ سب کچھ بڑے اعتماد سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

یہ اعتماد

ہمیں طلبہ و طالبات کے سلجھے ہوئے مضامین نے دیا جو پڑھائی میں ہمہ وقت مشغولیت کے باوجود ادبی تشنگی مٹانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ کس کا مضمون اچھا ہے؟ بس

یہ سمجھئے، جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

یہ اعتماد

ہمیں ملک گیر شہرت رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں نے دیا جن کی حسین تخلیقات بغیر کسی دقت اور اصرار کے مل گئیں بلاشبہ ان کے شہ پارے مجلے کی تزئین و آرائش کا باعث بنے ہیں۔ میں ان سب کی عظمت کو جھک کر سلام کرتا ہوں۔

یہ اعتماد

میگزین سیکریٹری ہاشم شریعت نے دیا۔ جنہوں نے ایرانی طالب علم ہوتے ہوئے بھی اردو مجلے میں خاص طور پر دلچسپی لی اور مجھے پوری آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا۔

یہ اعتماد

ہمیں ناصر محمود کے بنائے ہوئے کارٹونوں نے دیا۔ ایسے کارٹون آپ نے کسی کالج میگزین میں شاذ ہی دیکھے ہوں گے۔

یہ اعتماد

ہمیں ان ساتھیوں نے دیا جو وقتاً فوقتاً دامے، درمے قدمے، سخنے میرا حوصلہ بڑھاتے رہے اور مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔

یہ اعتماد

ہمیں ان ساتھیوں نے دیا جنہوں نے میرا حوصلہ پست کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اخبار میں میرے تقرر کو "انتخابی مہم" قرار دینے یا قلمی تعاون نہ کرنے سے ہمیں اس کے سوا کوئی فرق نہ پڑا کہ ہم نے اپنی ذمہ داری کو بہتر طور پر محسوس کیا۔ جہاں تک انتخابی پس منظر یا مہم کا تعلق ہے اس کا فیصلہ وقت کرے گا اور میرے مہربانوں کو اپنے اندازے پر یقیناً شرمندگی ہوگی۔

یہ اعتماد

ہمیں ان ساتھیوں نے دیا جنہوں نے گمنام خطوط لکھ لکھ کر عہدے سے دست برداری کا مشورہ دیا اور اس کے ساتھ ہی دھمکیوں کو اپنا وطیرہ بنایا۔ افسوس، کہ ان کے ان اقدامات نے محض "تندیٔ بادِ مخالف" کا کام کیا۔

یہ اعتماد

ہمیں عثمان صادق بلوچ نے دیا جنہوں نے میگزین کی تمام خطاطی اور مصوری کرنے میں دن اور رات کا فرق محسوس نہ کیا

اور سب سے بڑھ کر

یہ اعتماد

ہمیں اس ذاتِ باری تعالیٰ نے دیا جو عزت بخشنے اور ذلت دینے پر قادر ہے اور جس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

یہ تمام محنت جو ہم نے اور ہمارے ساتھیوں نے "نمودِ سحر" کے لئے کی اسی اعتماد کے ساتھ نذرِ قارئین ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

مدیر اعلیٰ

صداقت علی چوہدری

With the Compliments

of

Pfizer Laboratories Limited

KARACHI–DACCA

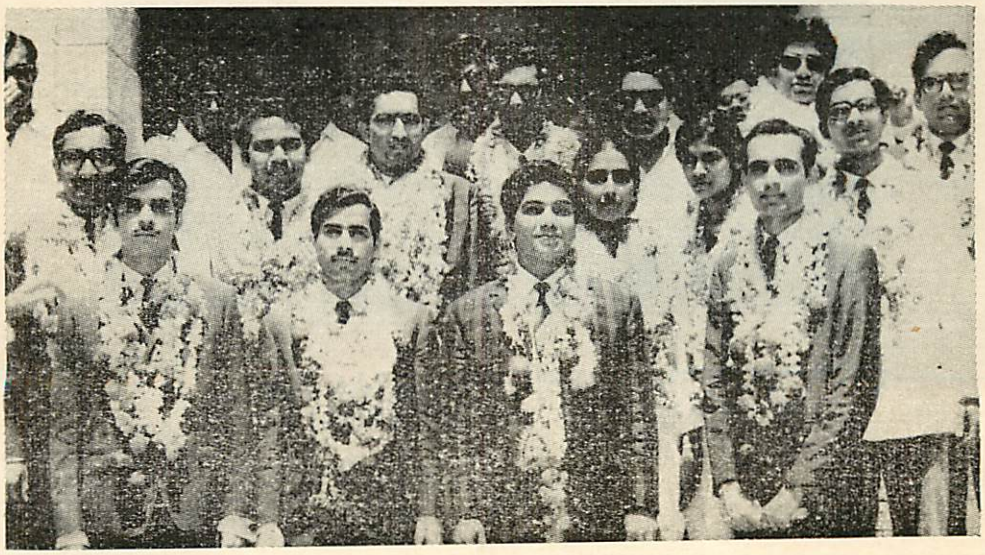

THE WINNERS OF D.M.C.S.U- *1970-1971*

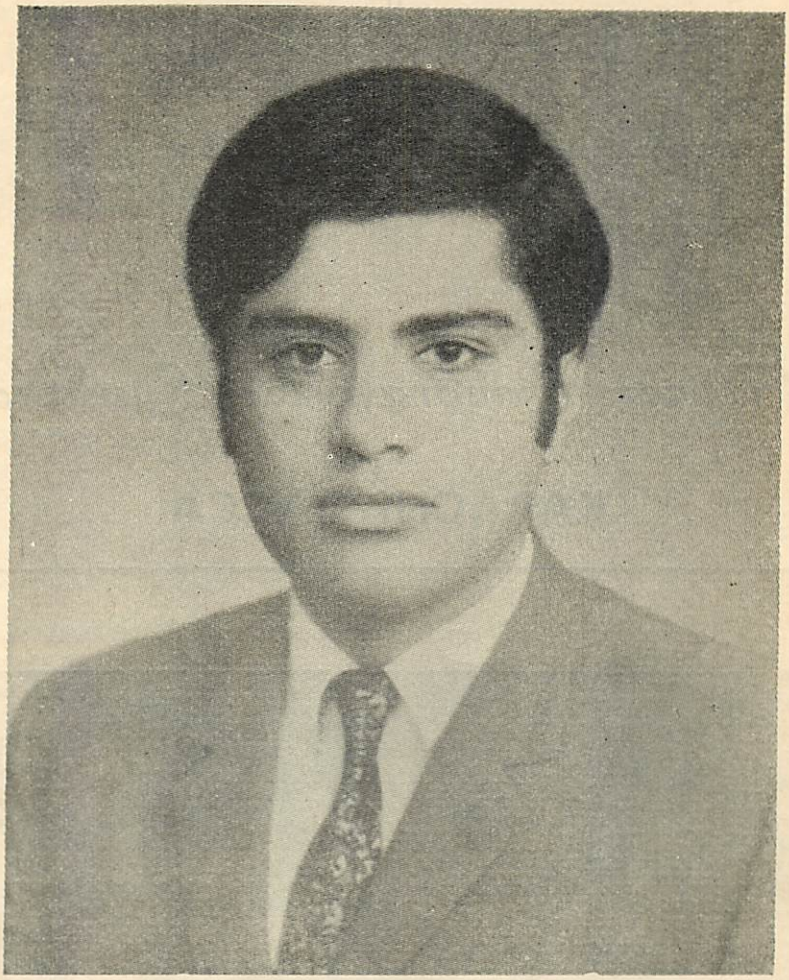

THE PRESIDENT D.M.C.S.U.
MR. ASIF ALI MANSURI

مدیرانِ معاون

سکندر جہاں

جمیلہ فردوس

معاونین خصوصی

سروے انچارج

نعیم احمد زبیر

معاونِ خصوصی بلبلِ شورید

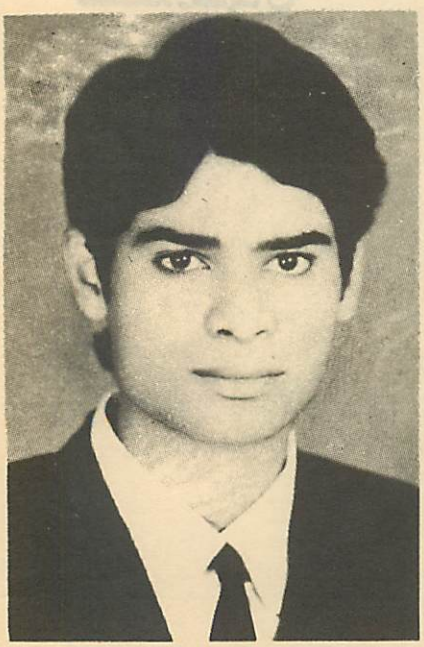

محمد امین وقار

آرٹسٹ

عثمان صادق بلوچ

معاون آرٹسٹ

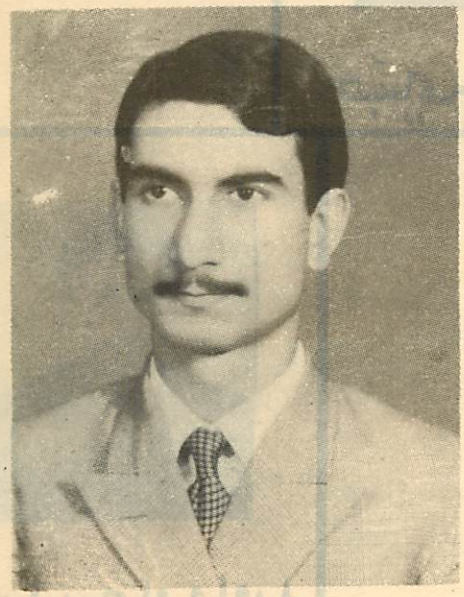

ناصر محمود

عابد نثار

امان اللہ خان

مجلسِ ادارت

صبیحہ قاضی

سید سجاد جاوید

طارق ظہور

اداریہ

اے بسا آرزو کہ

۱۹۴۷ میں پاکستان بنا۔
دو سال سنبھلنے میں لگے اور باقی عرصہ ہاؤ ہو کرنے میں۔
جو بھی آیا اُس نے اپنا بت بنایا۔
کسی نے بڑا کسی نے چھوٹا۔
اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ
کبھی ہلکے سروں میں اور کبھی تیز
پھر بے چینی بڑھی
نعرے لگے
اور بت ٹوٹے
پھر بت بنا
بڑا — قد آور — ناقابلِ تسخیر
شاید پھر صبر و سچائی کا امتحان مقصود تھا
پیمانہ چھلکا — بند ٹوٹا
نعرے لگے — ہڑتالیں ہوئیں
لاٹھیاں برسیں — لہو بہا
جوان لہو
سرخ لہو
پرجوش لہو
غیرت مند لہو
لہو رنگ لایا
اور خدا خدا کر کے بت ٹوٹا
واقعے، مختلف رنگ و بو کے
ولولے، ہوش اور جوش کے ساتھ
وسوسے، تحیر و تشکیک کے تھے
دھندلاہٹیں
جھٹکاہٹیں
سنسناہٹیں
چہار سو پھیل گئیں۔

عزم بالجزم کے ساتھ بزم ٹوٹی۔
فیصلوں کی سرحدیں رزم گاہ بنیں۔
مداریوں نے ہاتھ رنگے
سیاسی لال بجھکڑ اسی بات سے خوش ہو گئے کہ
اپنی ناک کٹی سو کٹی پرائی بدشگونی تو ہو گئی۔
لیکن وقت چپ چاپ کھڑا تھا۔
عقابی روحیں اور خنک روشنیاں بیدار تھیں۔
امنگوں کے دیپ جلنے لگے۔
اخلاقی اقدار کی پاسداری ہونے لگی۔
مبادا!
کہیں حزیمت نہ اٹھانی پڑے۔
کہیں چمن پھر خون آلودگیوں کا مرقد نہ بن جائے۔
سینہ چاکانِ چمن ہوش میں تھے
آہٹوں نے کہا
"سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے"
اللہ تعالیٰ حامی و ناصر ہوا
راستہ متعین ہوا
لیکن

بالآخر ملک ایسے دوراہے پر کھڑا تھا جہاں کوئی بھی راستہ منزل کو نہ جاتا تھا۔
ایک راستہ صوبائی عصبیت کا تھا۔
دوسرا راستہ لسانی عصبیت کا

صوبائی عصبیت نے گل کھلائے۔
بدرنگ، بدبودار اور بدشکل
علامہ اقبالؒ تک اس کی زد میں آئے۔
اقبالؒ پنجاب کا شاعر نہیں
اقبالؒ پاکستان کا شاعر نہیں
اقبالؒ برصغیر کا شاعر نہیں
اقبالؒ ایشیا کا شاعر نہیں
اقبالؒ دنیا کا شاعر ہے
اقبالؒ دنیا کا مفکر ہے
اقبالؒ انفرادی نہیں اجتماعی ملکیت ہے۔
جہاں اس بات کا ملال ہے کہ اقبالؒ کی تصویر جلی وہاں اس
بھی بے انتہا رنج ہے کہ ——
وہ اقبالؒ
جو ستاروں سے آگے کے جہاں ڈھونڈتا ہے
لوگ اُسے
افاقیت کی حدود سے نکال کر محدودیت کے
حصار میں لے آئے ہیں۔
اقبالؒ کے خوں پر کس کا کلیجہ چھینی نہ ہوا ہوگا۔
کیا ہمارے قائد کی روح لرز لرز نہ گئی ہوگی۔
لسانی عصبیت کی زد میں اُردو آئی اور دشمن کی زبان
قرار پائی۔
یہ بھی خوب ستم ظریفی ہے

مسلمان فاتحین اور مقامی ہندو لوگوں کے میل جول سے پیدا ہونے والی یہ زبان" اردو" جس کے معنی لشکری زبان کے ہیں۔ ماہرین لسانیات کے بقول ــــــ

سندھ، پنجاب، دھلی، دکن اور بنگال میں پروان چڑھی۔

آج وہی بنگال اردو کو یکسر ٹھکرا چکا ہے۔

اسی پنجاب میں پنجابی کی تحریکیں اُٹھ رہی ہیں۔

آج اُسی سندھ میں اردو کی مخالفت میں لیڈری چمکائی جا رہی ہے۔

پنجاب میرا ہے

بنگال میرا ہے

سندھ میرا ہے

بلوچستان میرا ہے

صوبہ سرحد میرا ہے

سیاسی کدورتوں کے اس دور میں بھی مجھے تمام علاقائی زبانوں سے یکساں محبت ہے۔

سندھی میری مادری زبان ہے

میری دُعا ہے یہ بڑھے، پھلے، پھولے

مجھے اس سے محبت ہے۔

لیکن اردو کی محبت ہمیشہ اس پر غالب آئی ہے۔

پشتو میری مادری زبان ہے

میری تمنا ہے یہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔

مجھے اس سے محبت ہے۔

لیکن اردو کی محبت ہمیشہ اس پر غالب آئی ہے۔

بلوچی میری مادری زبان ہے

میری دلی خواہش ہے کہ اسے بلندیوں پر دیکھوں

مجھے اس سے محبت ہے

لیکن اُردو کی محبت ہمیشہ اس پر غالب آئی ہے۔

پنجابی میری مادری زبان ہے

میری آرزو ہے کہ اسے چار چاند لگیں۔

مجھے اس سے محبت ہے

لیکن اردو کی محبت ہمیشہ اس پر غالب آئی ہے

بے شک مجھے ان زبانوں سے بے انتہا محبت ہے لیکن انھیں اردو کے مقابلے میں کھڑا کرنا حماقت ہے۔

عزت ایک اضافت ہے۔

ہر زبان کا اپنا خاص مقام ہے۔ اور اس کا اردو سے کوئی ٹکراؤ نہیں۔ علاقائی زبانیں وسعت کے لحاظ سے بھی محدود ہیں اور

حلقے کے لحاظ سے بھی۔

اردو سارے پاکستان کی زبان ہے۔

اور علم کی دولت سے بھی مالا مال ہے

پھر آخر یہ سیاسی شعبدے بازیاں کب ختم ہوں گی۔

اقتدار کی ہوس کا یہ شتر بے مہار کس کروٹ بیٹھے گا

اقتدار کی ہوس غالب ہو تو برگ و بار مختلف نہیں ہوتے۔

برسوں سے ہم اردو زبان کو اپنا چکے ہیں۔ اچھی
روایات کو ترک کرنا عاقبت نااندیشوں کا کام ہے۔
اردو کی قدر و منزلت کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
قائد اعظمؒ نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ
"اُردو اور صرف اردو ہی پاکستان کی قومی زبان ہوگی"
کیا ہم قائد اعظمؒ کو بھلا چکے ہیں؟
کیا ہم قائد اعظمؒ کو بھلا رہے ہیں؟
کیا ہم قائد اعظمؒ کو بھلا سکتے ہیں؟
مجھے اس کا جواب چاہیے۔
جواب کون دے گا؟

یہاں تک اداریہ لکھنے کے بعد میں رک گیا۔ مزید لکھنے کا دم نہ تھا۔
لکھنے کے سوا چارہ نہ تھا
گھٹی گھٹی فضا میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا لکھوں۔
ہنگاموں کے اس شہر سے دور میں ساحلِ سمندر پر پہنچ گیا۔
یہ فرار تھا۔
حقیقتوں سے فرار
سکون کی تلاش میں۔
آدمی اکیلا ہو تو تکلفات بھول جاتا ہے
ہم اکیلے تو بہت دفعہ ہوتے ہیں۔
پھر بھی ہماری آزادی محدود ہے۔
بند کمروں میں ہم آزاد ہوتے ہیں
تکلف کے پردے وہاں اٹھتے ہیں
گلیوں میں، بازاروں، محفلوں میں ہم قید ہوتے ہیں۔ اس
وقت ہم شرافت کے لبادے اوڑھ لیتے ہیں۔
کبھی کبھی یہ لباس تار تار ہو جاتا ہے۔
پھر ہم شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔
پانی بھید کھول دیتا ہے
پانی اس وقت بھی بھید کھول رہا تھا
آسمان پر سُرخی پھیلی تھی۔
سورج جھک رہا تھا۔
لہروں اور ساحل کے سنگم پر میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔
دور لہروں کے پیچ و خم میں ایک کشتی نظر آ رہی تھی۔
کشتی ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔
اور
ابھر ابھر کر ڈوب رہی تھی۔
مسافر سراسیمہ تھے۔
پھر سورج ڈوب گیا۔
کشتی ڈوبنے لگی۔
مجھے وحشت ہونے لگی۔
اندھیرا بھی ہو رہا تھا اور اندھیر بھی۔
میں سہم گیا۔
لہریں بپھر گئیں۔

مدیر اعلیٰ

صداقت علی چوہدری

مجلسِ ادارت

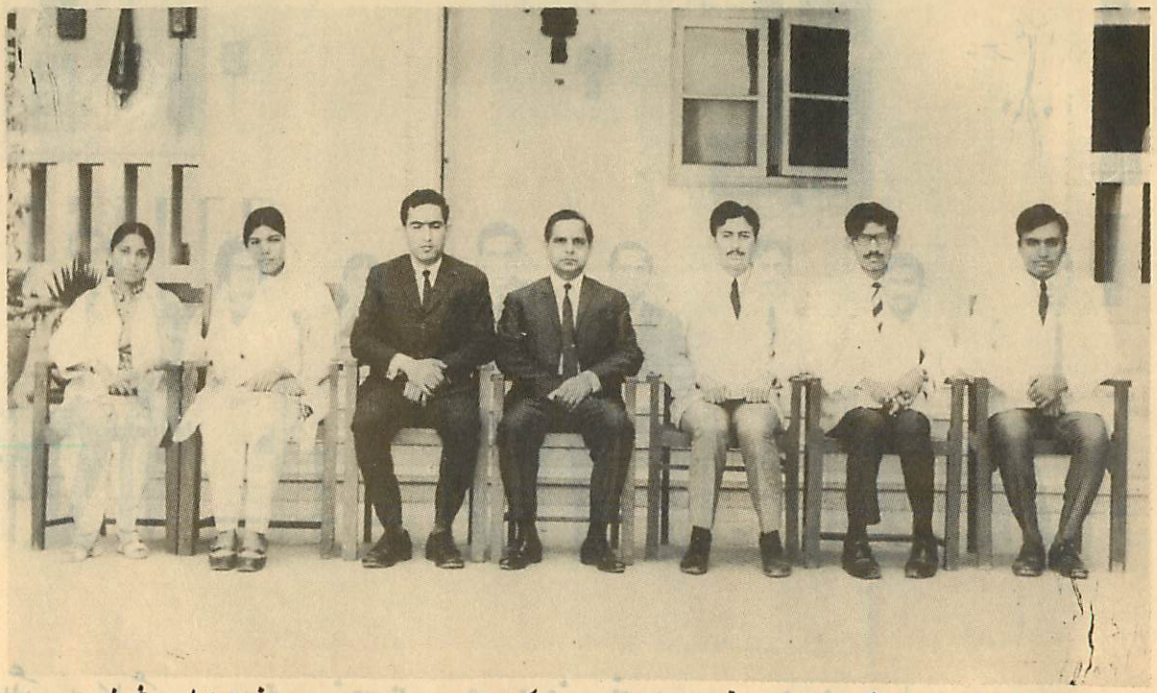

دائیں سے بائیں :- نعیم احمد زبیر، عثمان صادق بلوچ، صداقت علی چوہدری، پروفیسر فضل الٰہی، ہاشم شریعت
جمیلہ فردوس۔ نصرت سراج

مجلسِ ادارت

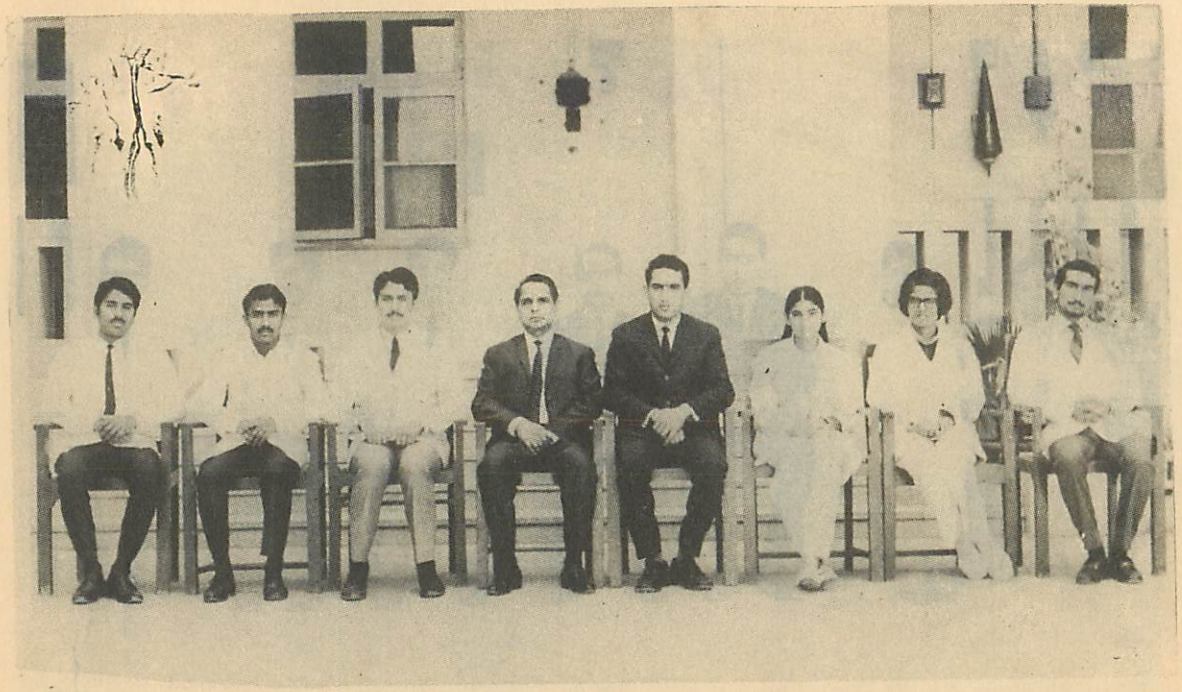

دائیں سے بائیں :- ناصر محمود، فوزیہ قدوس، صبیحہ قاضی، ہاشم شریعت، پروفیسر فضل الٰہی، صداقت علی چوہدری

سید سجاد جاوید، امان اللہ خاں

طلبا پروفیسر فضل الہٰی کے ہمراہ سالانہ پکنک پر

سالِ آخر کے طالب علم عبدالحق بلوچ (ایم اے) کے ساتھ طالب علم ساتھی

جنرل باڈی میٹنگ

ایک بچے کی صبح آنکھ کھلی تو اس نے اپنی ماں سے جیب خرچ مانگا۔ جواب ملا "دن تو چڑھ لینے دو"۔ بچہ دوبارہ لحاف میں گھس گیا۔ اب والدہ کا اصرار تھا کہ بارہ بجنے والے ہیں اور وہ ابھی تک سو رہا ہے۔

بجٹ باڈی میٹنگ چاہے کالج کی ہو یا کسی بڑے ادارے کی اسی قسم کے واقعات وہاں بھی پیش آتے ہیں۔

حزبِ اقتدار والوں کا اصرار ہوتا ہے کہ فلاں مقصد کے لئے زیادہ رقم درکار ہے۔ اور حزبِ اختلاف والوں کا موقف اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اور اگلے سال جب حزبِ اختلاف والے ہو جاتے ہیں تو دونوں کا موقف ایک دوسرے کے برعکس ہو جاتا ہے...... ڈاؤ میڈیکل کالج کی بجٹ کی جنرل باڈی میٹنگ گذشتہ سال بہت دھماکہ خیز ہوئی۔ کیمرہ میں اندر جانے کی جرأت نہ کر سکا۔ چنانچہ ناصر محمود آڑی ترچھی لائنوں کے ذریعہ آپکو بجٹ میٹنگ دکھا رہے ہیں۔

کارٹونسٹ :۔ ناصر محمود

بجٹ پاس ہو رہا ہے

بجٹ پاس ہو گیا

انتخاب

	صفحہ
دین اور دنیا	۴۳
نشتروں کے پسِ منظر میں	۷۷
زندگی رقص کناں	۱۱۱
بلبلِ شوریدہ	۱۴۵
بوئے گل	۱۷۹
نالۂ دل	۲۱۳
دودِ چراغِ محفل	۲۲۹
انشائے لطیف	۲۴۵
بے پر کی	۲۵۷

دین اور دنیا

"لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو کوئی ایسے حاکم کو دیکھے جو ظلم کرتا ہے، خدا کی قائم کی ہوئی حدوں کو پھلانگتا ہے، عہدِ الٰہی کو توڑتا ہے، اور دیکھنے والا دیکھنے پر بھی نہ تو اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرتا ہے اور نہ اپنے قول سے، سو خدا ایسے لوگوں کو اچھا ٹھکانا نہیں بخشے گا۔

دیکھو، یہ لوگ شیطان کے پیرو بن گئے ہیں۔ رحمٰن سے سرکش ہو گئے ہیں۔ فساد ظاہر ہے۔ حدودِ الٰہی معطل ہیں مالِ غنیمت پر ناجائز قبضہ ہے۔ خدا کے حلال اور حرام کو حلال ٹھیرایا جا رہا ہے۔ ایسی صورت میں میرا فرض ہے کہ ان کی سرکشی کو حق و عدل سے بدل دینے کی کوشش کروں۔

حالات تمہارے سامنے ہیں۔ دنیا کیا سے کیا ہو گئی! افسوس تم دیکھتے نہیں، حق پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ باطل پر علانیہ عمل کیا جا رہا ہے، اس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ مومن حق کی راہ میں جان قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائے میں شہادت ہی کی موت چاہتا ہوں۔ ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود ایک جرم ہے۔

اقتدارِ باطل

امامِ حسینؓ کی نظر میں!

SCANNED BY OFFICES OF AMIN H. KARIM MD

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مولانا صلاح الدین احمد

امت الکریم بیگم اسلمات آمنہ

مریم جمیلہ بیگم

احکامِ خداوندی

ناصر الدین کھوکھر

اے ایمان والو!

ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جسے اس نے اپنے رسول پر اتارا ہے اور کتابوں پر بھی جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں، اور جو انکار کرے گا اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کا اور آخرت کے دن کا تو وہ دور دراز کی گمراہی میں ہوگا (النساء ۔ ۲۰)

اے ایمان والو!

تم سب کے سب سلامتی میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ (البقرہ ۲۴)

اے ایمان والو!

تم ان میں سے خرچ کرو جو ہم نے تم کو دی ہیں چیزیں قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ تجارت ہو نہ دوستی اور نہ سفارش اور کفر کرنے والے ظالم ہیں۔ (البقرہ ۔ ۳۴)

اے ایمان والو!

تم اپنے صدقات احسان جتا کر اور تکلیف دے کر برباد نہ کرو۔ جیسا کہ ریاکار اپنا مال دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم قیامت پر ایمان نہیں رکھتا (البقرہ ۔ ۳۶)

اے ایمان والو!

تم سود نہ کھاؤ بڑھا چڑھا کر اور خدا سے ڈرتے رہو تاکہ تم نجات پاؤ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے اور خدا و رسول کی تابعداری کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (آلِ عمران) ۱۳)

اے ایمان والو!

تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بنو اور ان کو روکے رکھو تاکہ جو تم نے دیا ہے اس کا ایک حصہ لے لو مگر یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کی مرتکب ہوں۔ اور ان کے ساتھ عمدگی سے گذران کرو۔ پس اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو عنقریب ان چیزوں کو جن کو تم ناپسند کرو گے جن میں خدا نے بہت بھلائی رکھی ہے (النساء ۔ ۱۳)

اے ایمان والو!

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے سرداروں کی۔ پس اگر تم آپس میں جھگڑو کسی معاملے میں تو اللہ اور رسولؐ کی طرف رجوع کرو اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر یقین رکھتے ہو۔ یہ بہتر طریقہ ہے اور اس کا انجام بہتر ہے (النساء ۔ ۸)

ارشاداتِ رسول

ناصر الدین کھوکھر

" لوگو ! "

میری باتوں کو غور سے سنو ، کیونکہ میں آئندہ سال یا اس کے بعد اس مقام پر تم سے ملنے کا یقین نہیں رکھتا۔ لوگو! جیسا کہ یہ دن اور یہ مہینہ حرمت والا ہے ، اسی طرح ایک دوسرے کے جان و مال تم پر حرام ہیں۔ امانتیں ان کے مالکوں کے سپرد کرنی چاہئیں۔ دوسروں پر ظلم نہ کرو تاکہ تم پر بھی ظلم نہ کیا جائے۔ سود حرام ہے۔ شیطان اس سرزمین پر اپنی پرستش سے مایوس ہوگیا ہے لیکن یہ ہوگا کہ اس کی اطاعت چھوٹے چھوٹے امور میں کی جائے گی۔ لہٰذا تم شیطان کی اطاعت سے بچو۔ اے لوگو! عورتوں کا تم پر حق ہے جیسا کہ تمہارا حق ان پر ہے۔ عورتوں کے ساتھ بھلائی کرو۔ تمہیں عنقریب خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں سوال فرمائے گا۔ خبردار! خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا۔ لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی پیغمبر ہے اور نہ کوئی اور امت پیدا ہونے والی۔ خوب سن لو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔

" میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی ہدایت کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت دے۔ میں تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ میں تمہیں دوزخ سے ڈرانے والا اور جنت کی بشارت دینے والا ہوں۔ اللہ کے بندو! غرور اور تکبر اختیار نہ کرنا۔ جنت ان لوگوں کے لئے ہے جو تکبر اختیار نہیں کرتے۔ آخرت کی بھلائی متقیوں کے لئے ہے اور غرور کرنے والوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ "

" میدان جنگ میں حملے کی پہل تم نہ کرنا۔ ذاتی دشمنی کا انتقامی جذبہ پیدا نہ ہونے دینا۔ جو جنگ میں حصہ نہ لیں ان پر ہتھیار نہ اٹھانا۔ بوڑھوں ، عورتوں اور بچوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچانا۔ ۔ ۔ ۔ "

پنجگانہ نماز ادا کرو۔ رمضان کے مہینے میں روزے رکھو۔ اپنے مالوں کی زکوٰۃ دو۔ تمام مسلمان محکوم ہوں یا آزاد ، یکساں ذمہ اور حقوق رکھتے ہیں۔ اعمال دین کے سوا کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔ تم اپنے غلاموں کو وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور انہیں وہ لباس پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ ان پر نہ کوئی ظلم کرو اور نہ کوئی ان کا حق چھینو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

ناصر الدین کھوکھر

حمص کے لوگوں کا ایک وفد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ "آپ کے گورنر سعید بن عامر اپنے فرائض میں سخت کوتاہی کر رہے ہیں"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: "وہ کیا کرتے ہیں؟ تفصیل سے بتاؤ تاکہ باز پرس کی جا سکے"۔ اول یہ کہ جب تک اچھا خاصا دن نہیں چڑھ جاتا وہ گھر سے باہر نہیں آتے۔ دوسرے رات کو اگر ان کو آواز دی جائے تو وہ جواب نہیں دیتے اور تیسرے یہ کہ مہینے میں ایک دن تو بالکل گھر سے باہر نہیں نکلتے" وفد نے عرض کیا۔ "یہ تو بڑی سنگین شکایتیں ہیں۔ مجھے سعید بن عامر جیسے فرض شناس سے اس کی توقع نہ تھی۔ اچھا، انہیں بلواؤ تاکہ ان سے جواب طلبی کی جائے"۔ امیر المومنینؓ نے حکم دیا۔

سعید بن عامر حاضر ہو گئے۔ امیر المومنین نے وفد کے لوگوں سے فرمایا: "دیکھو، یہ سعید بن عامر ہیں، ان کے خلاف تمہیں جو شکایات ہیں، ان کے سامنے دوہراؤ"۔ وفد نے بلا کم و کاست شکایات دوہرائیں۔ امیر المومنین نے فرمایا: سعید تمہارے پاس کیا جواب ہے"؟۔ "امیر المومنین! یہ میرے اور میرے خدا کے درمیان ایک راز تھا جس کا تذکرہ مجھے پسند نہیں تھا، لیکن اب مجبوری ہے" سعید نے آزردہ خاطر ہو کر کہا اور شکایتوں کے جواب میں عرض کیا: "امیر المومنین! بات یہ ہے کہ میں نے دن لوگوں کی خدمت کے لئے وقف کیا ہے اور رات اپنے پروردگار کے لئے۔ رات بھر تو بندوں کی خدمت سے فارغ ہو کر نماز عشاء کے بعد گھر چلا جاتا ہوں اور اپنے رب کے حضور کھڑا ہو جاتا ہوں اس لئے اگر کوئی شخص رات کو مجھے پکارتا ہے، تو میں جواب نہیں دیتا" حضرت عمرؓ کا چہرہ فرط مسرت سے تمتمانے لگا۔ سعید بن عامر کہتے چلے گئے: "امیر المومنین میرے گھر میں ملازم نہیں ہے جو گھر کے کاموں میں میرا اور میری بیوی کا ہاتھ بٹائے۔ بیوی تمام کام تنہا نہیں کر سکتی۔ میں صبح کی نماز کے بعد گھر جاتا ہوں، تو آٹا گوندھتا ہوں اور روٹی پکاتا ہوں۔ پھر ہاتھ منہ دھو کر لوگوں کی خدمت کے لئے باہر آتا ہوں۔ اس وجہ سے مجھے گھر سے نکلنے میں دیر ہو جاتی ہے"۔ "اور تیسری شکایت کے متعلق تمہارا کیا جواب ہے؟" امیر المومنین نے حیرت سے پوچھا۔ "امیر المومنین! میرے پاس کپڑوں کا یہی جوڑا ہے جو میں پہنے ہوئے ہوں۔ جب یہ میلے ہو جاتے ہیں تو میں ان کو اتارتا ہوں اور خود ہی دھوتا ہوں اور جب یہ سوکھ جاتے ہیں تو پہن کر باہر نکل آتا ہوں۔ اس کام کے لئے مہینے میں ایک دن صرف کرتا ہوں اور اس روز سارا دن گھر کے اندر رہتا ہوں"۔ حضرت عمرؓ کا چہرہ فرط مسرت سے چمک اٹھا اور وہ بولے "اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے کار خلافت سرانجام دینے کے لئے مجھے ایسے لوگ عطا فرمائے ہیں"۔ پھر سعید بن عامر سے کہا "سعید! میں نے تمہارے بارے میں شکایات سن کر کوئی برا خیال نہیں کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان امور کی کوئی معقول وجہ ہو گی"۔

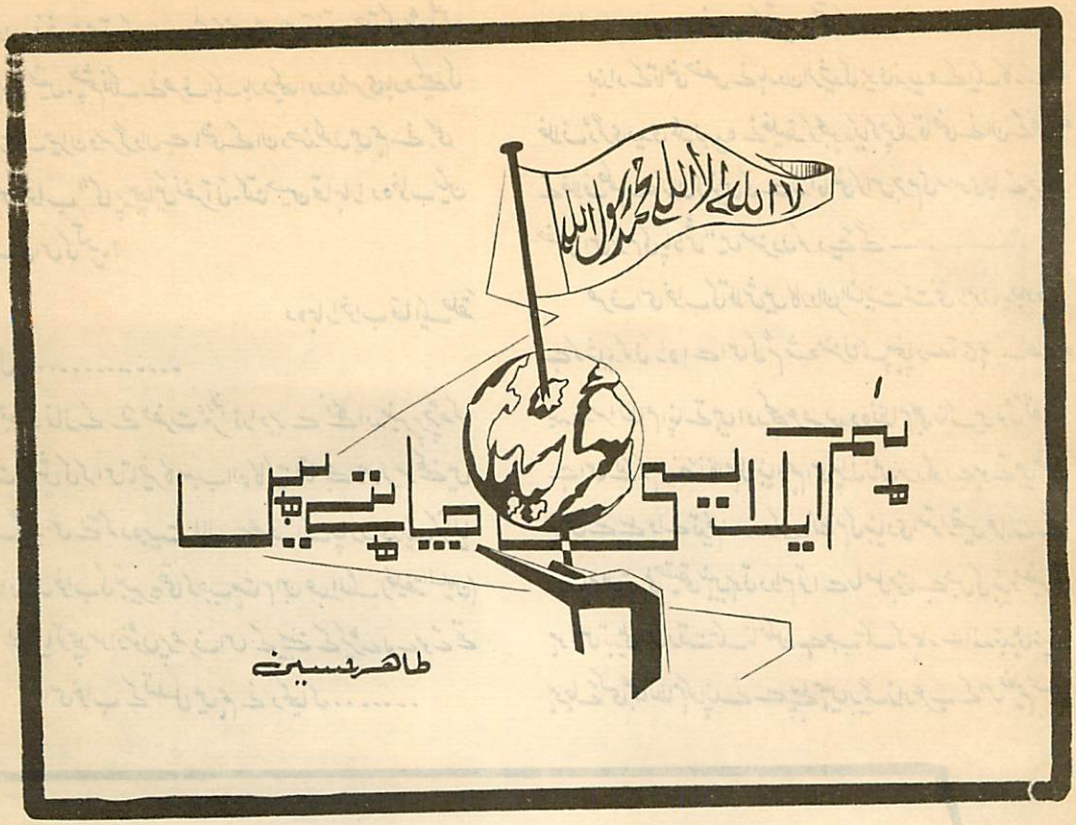

سوفسطائی نے سوچا اور اس سوچ کو ضابطۂ تحریر میں لایا اس کا فلسفہ انتہا پسندانہ انفرادیت کا پرچار کرتا تھا جس کی رو سے فرد سچائی و حقیقت کی کسوٹی تھا پھر سقراط نے حق بینی و حقیقت شناسی کے دائرہ کو صرف ان افراد تک محدود کر دیا جو صاحب علم ہوں مگر افلاطون نے اس فلسفۂ انفرادیت کے خلاف اور شاید تاریخ انسانی میں پہلی بار فرد کی نفی کر کے معاشرہ کو اقتدار اعلیٰ قرار دیا۔ ایک ایسا سمندر جس میں ہر فرد کی انفرادیت مثل حباب ٹوٹ کر ان گنت لہروں کی بے پایاں وسعت میں مدغم ہو جاتی۔ زمانہ کروٹیں بدلتا رہا فلسفی پیدا ہوتے رہے اور دنیا ان کے بنائے ہوئے رنگوں میں رنگتی رہی۔ رابرٹ فلمر نے اگر دنیا کو چرچ کے زیر نگیں سمجھا تو ہوبز نے بادشاہت کو نوع انسانی کی نجات کی راہ گردانا اور پھر کوئی لاک کی صورت میں کلیسائیت اور بادشاہت کی تمیز ذکذیب کا مظہر بنا۔ غرضیکہ تہذیب و تمدن کی ترقی اور دل کی تسکین کے لئے فلسفہ کی شوریدہ گرمی نے ہر ممکن و بہر طور نئی راہیں تراشیں اور غالب کو کہنا پڑا ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
درماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

مگر ! انسان آج بھی بے چین و بیقرار ہے وہ آج بھی بھوکا ہے ننگا ہے اس کے دل کی ویرانیاں اس کی روح کی تاریکیاں آج بھی کسی شعاع آفتاب کی منتظر ہیں کتنی تمنائیں ہیں کہ دلگیر ہیں کتنی آرزوئیں ہیں کہ مضطرب ہیں کہ نجانے کب وہ آفتاب ضوفشاں طلوع ہوا ! ایک بار اور صرف ایک بار وہ آفتاب طلوع بھی ہوا وادیٔ سینا میں — سرزمین حجاز میں — ریگزار عرب میں ! مگر وائے حسرت کہ درخشندہ و تابندہ ذرات نادرہ کے اس پیکر حسن و زیبائی کی حقیقی آب و تاب کو اس کے

ستائش گروں نے خود ہی مستور کر دیا۔ وہ لمحہ کہ جس میں اس آفتاب حق کی شعاعیں زمین بوس ہوئی تھیں۔ چشم فلک نے صرف ایک بار دیکھا اور دوسری بار دیکھنے کی ہوس میں آج تک حیران و سرگرداں ہے ماضی کے ان دھندلکوں میں ہم نے بھی جھانکا تو اس "خواب" کی پرچھائیں نظر آئی۔ کتنا حسین تھا ہمارا وہ خواب لیکن کتنی بھیانک تھی اس کی تعبیر!

وہ ہمارا خواب تھا ایک حلقۂ

دام خیال! .....

جمعہ کی نماز کے لئے حضرت عمرؓ ذرا دیر سے نکلے اور منبر پر چڑھ کر معذرت یہ پیش کی کہ اس تاخیر کا سبب ان کا کرتہ تھا جسے دھو کر سوکھنے میں وقت لگ گیا یہ اس لئے کہ وہ بیت المال سے صرف ایک چادر اور ایک کرتا لیا کرتے تھے اور اس خواب کی تعبیر یہ تھی کہ جب ہشام ابن عبدالملک (خلیفۃ المسلمین) حج کے لئے آیا تو چھ سو اونٹوں پر صرف اس کے پہننے کے کپڑے لدے ہوئے تھے اسی خواب کے تسلسل میں ہم نے دیکھا کہ.....

اور اس خواب کی تعبیر یہ تھی کہ.....

بغداد کے قاضی حفص نے ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ کے ایک کارندہ کے خلاف ڈگری دیدی مگر زبیدہ نے خلیفہ کو مجبور کیا کہ چونکہ قاضی نے ان کے کارندے کے خلاف حکم دے کر ان کی توہین کی ہے لہٰذا قاضی کو اس جرم کی سزا دی جائے چنانچہ حفص "اس جرم کی پاداش" میں معزول کر دیئے گئے ——— ".

صرف اسی خواب کی تلاش میں کاروان انسانیت نت نئی راہوں پہ جادہ پیما ہے کہ شاید کوئی راہ اسے اس کی گم شدہ منزل تک پہنچا دے آج ہم جس نظام کے بعد دوسرا نظام اپناتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد وہ نظام بھی خاک میں لوٹتا نظر آتا ہے اس لئے کہ ہر نئے نظام کی بنیاد ہم اسی پرانی زمین پر رکھ رہے ہوتے ہیں جس پر اس سے پہلے والے قدیم اور رد کردہ نظام کی بنیادی استوار تھیں عمارت کے در و بام میں تبدیلی حقیقی نہیں ہوتی دوام تو اسے حاصل ہوتا ہے جس کی بنیاد مضبوط ہو اصل تبدیلی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ ہمارے اندر تبدیلی نہ پیدا ہو جائے کسی بھی نظام کو اپنانے سے پہلے ہمیں ریگ زار عرب کے اس عظیم محسن

> وہ لمحہ کہ جس میں آفتاب حق کی شعاعیں
> بھی زمین بوس ہوئی تھیں چشم فلک نے صرف
> ایک بار دیکھا اور دوسری بار دیکھنے کی ہوس
> میں آج بھی حیران و سرگرداں ہے

حضرت عمرؓ بیت المال سے صرف دو درہم ہر روز لے رہے ہیں جو ایک مزدور کی کم از کم اجرت کے برابر ہے بہت جلد ہم نے اس تعبیر کا بھی نظارہ کیا کہ خلیفۃ المسلمین ماموں الرشید کے دسترخوان کا روزانہ خرچ دس ہزار درہم تھا۔

حضرت عمرؓ کسی مقدمہ میں بطور مدعا علیہ کے زیدؓ کی عدالت میں حاضر ہوئے حضرت زید ان کے احترام میں مسند سے کھڑے ہوئے تو عمرؓ نے جھڑک دیا کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ احترام کا یہ جذبہ غیر شعوری طور پر عدل میں مانع ہو عدالت کی نظر میں عمرؓ اور مدعی یکساں ہیں۔

انسانیت کے الفاظ یاد کرنے چاہئیں کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ نفس کا یہ انقلاب ہمارے دکھوں کا مداوا اور ہماری تکالیف کا تدارک ہے۔ اِلَّا اللّٰہ کی منزل لَا اللّٰہ کے بعد ہی آتی ہے۔

اسی منزل کی تلاش ہمارا مقصد اور یہی منزل ہمارا منتہا ہے اور

اگر بہ این نہ رسیدی تمام بولہبی است

فکر کی پختگی ہی اس اندرونی انقلاب کا موجب ہو سکتی ہے اور پختگی افکار ناممکن ہے جب تک فکر کی ہر افتاد اس سرچشمۂ علم و یقین سے ہم آہنگ و یک

رنگ نہ ہو جائے جس میں شکوک و اضطراب کو کوئی دخل نہیں اور جس کا آغاز سخن لاریب فیہ کے زلزلہ انگیز و کوہ تمثال دعویٰ حقیقت کشا سے ہوتا ہے میسن کے بقول انسان کی نجات اس میں نہیں ہے کہ وہ آسمان سے تارے توڑنے والی عقل حاصل کرے اس کی نجات کی راہ یہ ہے کہ وہ علم کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کا ارتقاء بھی کرتا جائے تاکہ اسے اپنے علم کا صحیح مصرف معلوم ہو سکے ... کہتا ہے کہ انسان کے ارتقاء سے مقصود یہ ہے کہ وہ ان ... سے آگے بڑھ جائے جو مادی فطرت نے انسان پر عائد کی ہیں یہی انسانی نفس کی منزل ہے اور یہی اس کا مقصد منتہا ! ایسی دنیا کا قیام جس کا خواب کبھی ہم نے وادی ... میں دیکھا تھا ہماری تگ و دو ... کا حاصل ... ہی وہ دنیا ہو گی جس میں کوئی ... ہٹلر جیو پالیٹکس کے اصولوں پر انسان کی گروہ ... بندی نہیں کر پائے گا اور نیشنلزم کا دلفریب طلسم انسانی خون کا سمندر نہ بہا سکے گا۔ رشدل کے الفاظ میں انسانی دنیا میں مثالی معاشرہ وہ ہو گا جس میں کیفیت یہ ہو کہ میں کسی دوسرے کی نشو و نما کی فکر کروں اور اسی میں اپنا مفاد اور خیر سمجھوں اور اسی طرح وہ میری نشو و نما کی فکر کرے اور اسی میں اپنا مفاد و خیر سمجھے" چنانچہ یہ مثالی دنیا اس کیفیت کا نام ہو گی جس میں ہر فرد معاشرہ کی بہبود کے لئے وہی کچھ کرے جو وہ معاشرے سے اپنی بہبود کے لئے چاہتا ہے

یک جہتی کے اس احساس کے بغیر تعمیر انسانیت خیال خام ہے کیونکہ بقول ممفورڈ "فرد کو اپنی ذات کی تکمیل کے لئے ایک عالمگیر معاشرہ کی ضرورت ہے" اس طرح ان مقاصد کی مملکت کا قیام عمل میں آسکتا ہے جو کانٹ کے نظریہ کے ماتحت نوع انسانی کے بلند ترین مقاصد ہیں۔

اس عالمگیر مملکت کا قیام انسانی دنیا کے لئے نہایت خوش آئند ہو گا ایسی ہی دنیا میں انسان اس حیثیت کا حامل ہو گا جو مکارم اخلاق کا معیار قرار پائے ہم ایک ایسی ہی دنیا چاہتے ہیں جہاں فکر و نظر کی بلندی اس معراج کبریٰ کی ہمدوش ہو جائے جہاں پہنچ کر انسانی تعلقات جغرافیائی حد بندیوں اور رنگ و نسل ... سے ماوراء ہو جاتے ہیں ہم ایک ایسی ہی دنیا چاہتے ہیں جس کی فضائیں ان پھولوں کی خوشبو سے معطر ہوں جنہیں گلدستہ محسن انسانیت کے مبارک ہاتھوں محراب کعبہ میں رکھا گیا تھا اور یہ تعطر ہمارے ذہنوں کو اتنا مطہر کر دے کہ ہم انسان کو اس کے رنگ و نسل سے نہیں بلکہ اس کے تقویٰ و طہارت کی نسبت سے پہچانیں ایک ایسی دنیا جہاں احترام آدمیت کی بنیاد میں انسان ہونے کی جہت پر استوار ہوں ایک ایسی دنیا جہاں روسو اور والٹیئر کی روحوں کے وارث صرف نائٹ ... سے گفتگو ہی نہ ہوں بلکہ وہ اجنتا و ایلورا کے سینوں میں بھی دھڑکتے ہیں۔

کتنا حسین تھا وہ ہمارا خواب اور کتنی بھیانک ہے اس کی تعبیر

ہم ایک ایسی دنیا چاہتے ہیں جہاں حبشی غلام کی حیثیت دودمان ہاشمی کے چشم و چراغ کے مساوی ہو اور ہمارے اس گم گشتہ خواب" کی مانند یہ مساوات صرف مسجد ہی کی نہیں بلکہ دستر خوان کی بھی مساوات ہو اور اس مثالی دنیا کے قیام کے لئے ہمیں کسی ایک یا دوسرے نظام کی ضرورت نہیں (مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں) ہمیں نئی صداؤں کی احتیاج نہیں نئے مقصدوں کی تلاش نہیں ہمیں آگے نہیں بڑھنا پیچھے ہٹنا ہے دور ماضی کے دھندلکوں میں وہ نظام کریں ... بدل دینا ہے اس صدا کی بازگشت سنائی دے رہی ہے کاش کوئی نگاہ حق شناس اسے دیکھ سکے کوئی دل بینا اسے سن سکے یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است !

قرآن مجید کا اثر

مریم جمیلہ بیگم

قرآن مجید تک رسائی حاصل کرنے کے لئے مجھے عجیب اور پیچیدہ راستے اختیار کرنے پڑے۔ چونکہ میں منزل پر بڑے احسن طریق سے پہنچی اس لئے مجھے اپنے تجربات پر کبھی بھی افسوس نہیں ہوا۔

عہد طفولیت ہی سے مجھے موسیقی بڑی اچھی لگتی تھی خصوصاً وہ استادی گانے تو مجھے بہت ہی پسند تھے، جنہیں دیار مغرب میں بلند ثقافت سمجھا جاتا تھا۔ سکول میں موسیقی میرا پسندیدہ مضمون تھا اور اس میں اکثر مجھے اچھے نمبر حاصل ہوتے تھے جب میں گیارہ سال کی ہوئی تو مجھے ریڈیو پر عربی موسیقی سننے کا اتفاق ہوا۔ جو مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے اسے پھر سننے کا فیصلہ کر لیا۔ جب بھی میں عربی موسیقی سنتی، مغربی موسیقی کے لئے میرے دل میں کشش باقی نہ رہتی۔ میں نے والدین کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ایک دن میرے والد مجھے نیویارک کے شامی علاقے میں لے گئے۔ جہاں سے میں نے اپنے گراموفون کے لئے بہت سے عربی ریکارڈ خریدے۔ ان میں سے جو سب سے زیادہ مجھے پسند آیا وہ ام کلثوم کا وہ ریکارڈ تھا جس میں اس نے سورۂ مریم کی تلاوت کی تھی۔ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ یہ عورت آئندہ کس بُرے راستے پر گامزن ہونے والی ہے لیکن مجھے اس کی سریلی آواز اور عقیدت بڑی پسند آئی۔ انہی ریکارڈوں کی بدولت میں عربی موسیقی کی گرویدہ بن گئی۔ حالانکہ میں عربی الفاظ کا مطلب بالکل نہ جانتی تھی۔ عربی موسیقی کی اس بنیادی قدر و منزلت کے بغیر میرے دل میں تلاوت کی محبت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ حالانکہ یہ ایک مغربی باشندے کے لئے اجنبی تھی۔ میرے والدین، رشتہ دار اور احباب عربی اور عربی موسیقی کو ازحد دقیانوسی اور تکلیف دہ سمجھتے تھے اس لئے جب میں ریکارڈ بجانے لگتی تو اُن کا ہمیشہ یہی مطالبہ ہوتا کہ میں تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر لوں تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔ ۱۹۶۱ء میں قبول اسلام کے بعد نیویارک کی مسجد میں بیٹھ کر جب مشہور و معروف مصری قاری عبدالباسط کی تلاوت کا ٹیپ ریکارڈ سنتی تو مسحور ہو جاتی۔ لیکن ایک نماز جمعہ میں امام صاحب نے ریکارڈ نہ بجایا۔ کیونکہ اس دن ایک مہمان خصوصی آیا ہوا تھا۔ یہ ایک پستہ قامت معمولی لباس میں ملبوس سیاہ فام نوجوان تھا جو زنجبار کا ایک طالب علم تھا۔ جب اس

نے سورۃ الرحمٰن کی تلاوت شروع کی تو ایسا معلوم ہوا کہ میں نے اس سے پہلے اتنی شاندار تلاوت کبھی نہیں سنی، قاری عبدالباسط بھی اس کے مقابلے میں ہیچ تھا۔ اس سیاہ فام افریقی نوجوان کی آواز نہایت سریلی تھی یقیناً حضرت بلال حبشیؓ کی آواز بھی بہت کچھ اس سے ملتی ہوگی۔

دس سال کی عمر ہی سے میں نے عربوں کے متعلق وہ ساری کتابیں پڑھ ڈالیں جو مجھے سکول یا اپنے فرقے کی لائبریریوں سے حاصل ہوسکیں خصوصاً وہ کتب جن میں یہودیوں اور عربوں کے تاریخی تعلقات کا ذکر تھا۔ لیکن قرآن مجید کے متعلق اپنے تجسس کی تسلی کرنے میں نو سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا۔ آہستہ آہستہ جب بلوغت کی عمر کو پہنچی تو مجھے یقین ہوگیا کہ اسلام کو عربوں نے اس بلند مرتبے پر نہیں پہنچایا بلکہ اسلام نے عربوں کو صحرائی بادہ نشینوں سے دنیا کا حکمران بنا دیا۔ جب میرے دل میں اس انقلاب کی وجوہات دریافت کرنے کا شوق پیدا نہ ہوا اس وقت تک قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا۔

۱۹۵۲ء کے موسم گرما میں، کالج میں بہت سے مضامین کا کورس اختیار کر لینے سے میرے دل و دماغ پر سخت دباؤ پڑا۔ اگست میں میں علیل ہوگئی اور میں نے سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیا۔ ایک شام جب میری والدہ پبلک لائبریری جانے لگیں تو مجھ سے پوچھنے لگیں کہ کوئی کتاب منگواؤ گی۔ میں نے کہا کہ مجھے قرآن مجید کا ایک نسخہ لا دیں۔ ایک گھنٹہ بعد جب وہ لوٹیں تو ان کے ہاتھ میں قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ تھا۔ جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے ایک عیسائی عالم اور مبلغ جارج سیل نے کیا تھا۔ چونکہ اس کی زبان بڑی فرسودہ قسم کی تھی اور اس میں عیسائی نقطۂ نگاہ سے متن کو بگاڑنے کے لئے حواشی میں البیضاوی اور زمخشری کے حوالے دیئے گئے تھے، اس لئے میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ اس زمانے میں اپنے ناپختہ دماغ کی وجہ سے قرآن کو تورات کے مانوس قصص کی مسخ شدہ اور محرف شکل کے سوا کچھ نہ سمجھتی تھی۔

قرآن کے متعلق میرا پہلا تاثر کچھ اور تھا مگر میں اس کے مطالعے سے باز نہ رہ سکی۔ میں تین دن رات تک مسلسل اس کے مطالعے میں منہمک رہی اور جب میں نے اسے ختم کر لیا تو میری تمام توانائی ختم ہو کر رہ گئی۔

میری عمر اس وقت صرف ۱۹ سال کی تھی اور میرا حال یہ تھا کہ میں اپنے آپ کو ایک اسی سالہ بوڑھیا کی طرح کمزور محسوس کرنے لگی۔ اس کے بعد میری پوری توانائی کبھی بحال نہ ہوسکی۔

میں قرآن کے متعلق اپنی اس رائے پر قائم رہی۔ ایک دن میں نے ایک دکان پر محمد مارماڈیوک پکتھال کے انگریزی ترجمہ قرآن کا ایک سستا ایڈیشن دیکھا۔ جونہی میں نے اسے کھولا، وہ میرے لئے ایک عظیم انکشاف ثابت ہوا۔ اس کی فصاحت و بلاغت نے میرے پاؤں اکھاڑ کر رکھ دیئے۔ پکتھال نے اپنے دیباچے کے پہلے پیراگراف میں لکھا تھا۔

اس ترجمہ کا مقصد انگریزی خواں طبقے کے سامنے یہ بات پیش کرنا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان قرآن کے الفاظ سے کیا مفہوم لیتے ہیں اور قرآن کی ماہیت کو موزوں الفاظ میں سمجھانا اور انگریزی بولنے والے مسلمانوں کی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ معقولیت کے ساتھ یہ دعوے کیا جاسکتا ہے کہ کسی الہامی کتاب کو ایک ایسا شخص عمدگی سے پیش نہیں کرسکتا۔ جو اس کے الہامات اور پیغام پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ یہ پہلا انگریزی ترجمہ ہے جو ایک ایسے انگریز نے کیا جو مسلمان ہے۔ بعض تراجم میں ایسی تفسیریں کی گئی ہیں۔ جو مسلمانوں کے لئے دل آزار ہیں اور تقریباً سب میں زبان کا ایسا انداز بیان اختیار کیا گیا ہے جسے مسلمان غیر موزوں سمجھتے ہیں۔ قرآن کا ترجمہ ناممکن ہے۔ یہ قدیم شیوخ کا اور میرا عقیدہ ہے میں نے اس کتاب کو علمی انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے لئے کوشش کی گئی ہے کہ موزوں زبان استعمال کی جائے لیکن یہ ترجمہ قرآن مجید نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ تو بے مثل و بے عدیل ہے اس میں اتنی ہم آہنگی ہے کہ لوگ اسے سنتے ہی رونے لگتے اور وجد میں آجاتے ہیں یہ تو قرآن کے مفہوم کو انگریزی میں پیش کرنے کی محض ایک کوشش ہے اور اس کے سحر کی قدر سے کاسی، یہ عربی قرآن

کی جگہ نہیں لے سکتا۔ نہ میرا یہ مقصد ہے ــــ"

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ سیل کا ترجمہ کیوں اتنا ناموزوں لگا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس کا اور دوسرے غیر مسلموں کا ترجمہ قرآن پڑھنے سے انکار کر دیا۔ پکتھال کا ترجمہ پڑھنے کے بعد میں نے عبداللہ یوسف علی، محمد علی لاہوری اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے تراجم کا مطالعہ کیا۔ اور مجھ پر فوراً انکشاف ہوا کہ یوسف علی اور محمد علی کی تفسیر غیر موزوں ہے اس کی وجہ اُن کا لہجہ اور دوراز کار اور غیر معقول کوشش تھی جو انہوں نے اُن آیات کی تشریح میں کی تھی۔

جو جدید فلسفے اور سائنسی تصورات سے متصادم ہوتی ہیں اُن کا متن کا ترجمہ بھی کمزور تھا، گو مولانا دریا بادی نے اپنے ترجمے میں تورات کے شاہ جیمز کے ترجمے کے نمونے پر قدیم اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ مجھے ان کی تفسیر عمدہ معلوم ہوئی خاص کر اس کا وہ حصہ جس میں مختلف مذاہب کا ذکر ہے اور میں نے اس سے بہت کچھ حاصل کیا۔ بہرکیف پکتھال کا ترجمہ مجھے بہت پسند آیا اور آج کے دن تک مجھے اس کے مقابلے کا کوئی انگریزی ترجمہ نہیں مل سکا۔ کسی ترجمے میں وہ فصاحت و بلاغت اور اندازِ بیان نہیں جو اس میں موجود ہے۔ بہت سے دوسرے تراجم میں اللہ کے لئے "گاڈ" کا لفظ استعمال کرنے کی غلطی کی گئی ہے لیکن پکتھال نے ہر جگہ "اللہ" ہی استعمال کیا ہے۔ اس سے اسلام کے پیغام میں مغرب کے قاری کے لئے بڑا اثر پیدا ہوتا ہے۔ جب تک میں ہسپتال میں صاحبِ فراش رہی پکتھال کا ترجمہ مسلسل میرے زیرِ مطالعہ رہا۔ میں نے اُسے بار بار پڑھا۔

اللہ تعالیٰ پکتھال پر برکات نازل کرے جس نے امریکہ اور انگلستان کے باشندوں کے لئے قرآن کی تعلیمات کا مطالعہ آسان بنا دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو میں اُس سے لاعلم رہتی اور اس کی قدر نہ کر سکتی۔

۱۹۰۹ء میں ہسپتال سے باہر آنے کے بعد میں فرصت کے اوقات میں نیویارک پبلک لائبریری کے مشرقی شعبے میں بیٹھ کر اسلام کے متعلق کتب کا مطالعہ کرتی۔ یہیں مجھے مشکوٰۃ المصابیح مترجم الحاج مولانا فضل الرحمٰن کلکتوی کی چار ضخیم جلدوں کا پتہ چلا اور مجھے اس بات کا علم ہوا کہ قرآن مجید کو موزوں اور مفصل طور پر سمجھنا اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک متعلقہ حدیث کا پتہ نہ ہو۔ کیونکہ نبی اکرمؐ کے اسوہ اور فرمودات کے سوا قرآنِ حکیم کی تفسیر کس طرح ممکن ہو سکتی ہے۔ جن پر یہ نازل ہوا تھا! وہ لوگ جو منکرِ احادیث ہیں وہ منکرِ قرآن ہیں۔

مشکوٰۃ کے مطالعے کے بعد میں نے قرآن کو الہامی کتاب مان لیا۔ جس چیز نے مجھے اس بات کا قائل کر دیا کہ قرآن منجانب اللہ ہے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں وہ اُس کے تسلی بخش جوابات ہیں۔ جو اُس نے زندگی کے تمام اہم مسائل کے متعلق دیئے ہیں اور یہ ایسے ہیں کہ مجھے کسی دوسری جگہ نہیں ملے۔

میں بچپن میں موت سے بڑی خوفزدہ رہا کرتی تھی خاص کر اپنی موت کے خیال سے اتنا ڈرتی تھی کہ بعض مرتبہ خواب دیکھنے کے بعد آدھی رات کو چیخنے لگتی اور والدین کو جگا دیتی۔ جب میں اُن سے دریافت کرتی کہ میں کیوں مروں گی اور موت کے بعد میرا کیا بنے گا تو وہ صرف اتنا کہہ دیتے کہ وہ ناگزیر ہے اور مجھے اسے قبول کرنا ہوگا اور چونکہ طبی سائنس ترقی کر رہی ہے شاید میں ایک سو سال تک زندہ رہوں۔ میرے والدین، خاندان کے باقی افراد اور تمام دوست احباب بڑی نفرت کے ساتھ حیات بعد الممات، روزِ حشر، جنت کے انعامات اور دوزخ کی سزا کو توہم پرستی اور فرسودہ عقائد سمجھتے تھے تورات کے انبیاء بطریق اور اولیا کے متعلق جن معلوم ہے کہ انہیں سزا و جزا اسی دنیا میں ملی تھی حضرت ایوبؑ کی کہانی مشہور ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اُس کے ایمان کی آزمائش کی جائے۔ حضرت ایوبؑ نے رو رو کر خدا سے فریاد کی کہ اُس نے کیوں ایک نیکوکار انسان کو مصائب میں مبتلا کیا۔ کہانی کے خاتمے پر اللہ تعالےٰ اُن کے تمام دنیاوی نقصانات کی تلافی کر دیتے ہیں۔ لیکن اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کی حیات بعد الممات میں انہیں کیا جزا ملی۔ میں نے انجیل میں بھی اس کا ذکر دیکھا اور اس کا مقابلہ قرآن مجید سے کیا انجیل کا بیان مبہم ہے۔ میں نے قدیم یہودیت میں بھی مسئلہ موت کا کوئی حل نہیں پایا۔ کیونکہ تالمود کی تعلیم یہ ہے کہ بہترین موت سے بدترین زندگی اچھی ہے۔ میرے والدین کا فلسفہ یہ تھا کہ موت کے خیال کو دل میں ہرگز نہ دینا چاہیئے اور زندگی کی عطا کردہ مسرتوں سے مقدور بھر لطف اندوز ہونا چاہیئے ان کے خیال میں زندگی کا مقصد یہ تھا کہ انسان خوش و خرم اور مسرور رہے، اپنے خاندان سے پیار کرے دوست احباب سے تعلقات بڑھائے اور اُن تفریحات میں منہمک رہے جن کی امریکہ میں فراوانی ہے۔ وہ زندگی کی اس مصنوعی شکل کے سختی سے قائل تھے۔ گویا یہ اُن کی مسرت

اور خوش قسمتی کی ضامن تھی۔ میں نے تلخ تجربے سے معلوم کیا کہ ان باتوں سے پریشانی نصیب ہوتی ہے۔ اور ذاتی قربانی اور جدوجہد کے بغیر کوئی قابل قدر چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔

میں اپنے بچپن ہی سے اہم اور بڑے بڑے کام کرنا چاہتی تھی سب سے زیادہ میں اس بات کی خواہشمند تھی کہ اپنی موت سے پہلے مجھے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ میں نے اپنی زندگی کے ایام پُر معصیت اعمال میں ضائع نہیں کئے۔ میں زندگی بھر سنجیدہ مزاج رہی ہوں۔ میں نے ہمیشہ عصر جدید کی ثقافت سے نفرت کی ہے جس کا بڑا چرچا ہے ایک مرتبہ میرے والد نے مجھے یہ کہہ کر سخت پریشان کر دیا کہ دنیا میں کوئی چیز بھی مستقل قدر کی حامل نہیں ہے اس لئے ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ ہم جدید رجحانات کو ناگزیر سمجھیں اور اپنے آپ کو اُن کے سانچے میں ڈھال لیں۔ لیکن میں ہمیشہ اس بات کی خواہاں رہی کہ کوئی ایسی چیز حاصل کروں جو تا ابد قائم رہے۔ اور یہ بات میں نے صرف قرآن مجید سے سیکھی کہ ایسا ممکن ہے۔ اگر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کوئی نیک عمل کیا جائے تو وہ ضائع نہیں ہوتا۔ اگر اسے دنیاوی انعام نہ بھی ملے تو اسے اس زندگی کے بعد ضرور ملے گا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ وہ لوگ جو اخلاقی اقدار سے رہنمائی حاصل نہیں کرتے اور آزادی سے من مانی کرتے ہیں۔ انہیں اس دنیا میں کتنی کامیابی اور دولت حاصل کیوں نہ ہو جائے۔ اور وہ اپنی مختصر زندگی کو گنتی ہی حسرتوں میں کیوں نہ بسر کریں۔ قیامت کے دن ضرور گھاٹے میں رہیں گے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہم حقوق اللہ اور حقوق العباد پورا کرنے پر پوری توجہ دیں اور ایسے تمام اعمال اور سرگرمیوں کو ترک کر دیں جو ہمیں اس راستے سے بھٹکاتی ہیں۔ قرآن کی ان تعلیمات کو احادیث نے اور زیادہ اجاگر کر دیا ہے۔ اور میں نے انہیں اپنے مذاق کے عین مطابق پایا ہے۔ جب میں آغوشِ سلام میں آئی۔ میرے والدین، رشتہ داروں اور دوست احباب نے مجھے دیوانی سمجھا۔ کیونکہ میں اس کے بغیر کسی اور بات کا تصور تک نہ کر سکتی تھی۔ اُن کے نزدیک مذہب ایک نجی معاملہ تھا جس میں دوسرے اشغال کی طرح ترقی کی جا سکتی تھی۔ لیکن جب میں نے قرآن مجید کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اسلام کسی لہو و لعب کا نام نہیں ہے۔ اسلام زندگی کی محض ضرورت ہی نہیں، بلکہ خود زندگی ہے!

ایک فرد کو ایسا ماحول میسر آ جاتا ہے۔ جس میں وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کر سکتا ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ بعض اوقات میں اُن باتوں پر عمل پیرا نہیں ہو سکتی جن کا اسلام تقاضا کرتا ہے لیکن میں نے اپنی کمزوریوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے قرآن و سنت کی دور از کار تاویلات کرنے کی جرأت نہیں کی۔ میں جب بھی کسی غلطی کی مرتکب ہوتی ہوں، فوراً اس کا اعتراف کر لیتی ہوں۔ اور اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

میرے جیسی ہستی کے لئے امریکہ میں کوئی جگہ نہ تھی اور میں مستقبل سے مایوس تھی میں وہاں نکلی اور پاکستان پہنچ گئی

معاشرتی لحاظ سے مکمل طور پر ناموزوں رہی۔ میں ایک سنجیدہ دل و دماغ کی دوشیزہ تھی، ہر وقت لائبریری میں کتابوں کے ڈھیر میں غرق رہتی تھی۔ میں سینما، رقص اور موسیقی سے متنفر تھی۔ مجھے مخلوط پارٹیوں سے نفرت تھی۔ مجھے رومان، شان و شوکت، سنگار، زیورات، فیشن ایبل لباس میں کوئی دلچسپی نہ تھی اس لئے مجھے اس سرد مہری کی پوری سزا ملی۔

میرے جیسی ہستی کے لئے امریکہ میں کوئی جگہ نہ تھی، اور میں مستقبل سے مایوس تھی، میں وہاں سے نکلی اور پاکستان پہنچ گئی۔ گو پاکستان کی فضا بھی ہر دوسرے مسلم ملک کی طرح یورپ اور امریکہ سے آنے والے خطرناک گرد و غبار سے آلودہ ہے۔ پھر بھی نیک مسلمانوں کی کمی نہیں ہے۔ جن کی بدولت وہ مسرت جو مجھے اپنی حیاتِ نو کی طفیل نصیب ہوئی ہے۔ سراسر اس حقیقت کی مرہونِ احساس ہے کہ نسوانی کردار کی اُن صفات کو اسلام میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جنہیں مغربی معاشرے میں نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اقبال کا نوجوان

مولانا صلاح الدین احمد

جن صاحبوں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ بات مخفی نہیں کہ دیگر اکابر فن کے کارناموں کی طرح اقبال کی شاعری بھی تین واضح حصوں میں منقسم ہے ان کے شباب کی شاعری، ان کی پختہ سالی کی شاعری اور آخر میں ان کی بڑھاپے کی شاعری۔ لیکن یہ ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز بات ہے کہ ان تینوں ادوار میں ان کا مخاطب صرف نوجوان اور موضوع سخن بیشتر وہ کیفیات رہی ہیں جو شباب سے خاص ہیں اور یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقبال اگرچہ اپنی جوانی ہی میں بلوغ فکر کے اعتبار سے پختہ سال، اور پختہ سالی میں پیر دانا ہو چکے تھے لیکن ان عناصر کے اعتبار سے جو ان کی اپنی شاعری، ان کے فکر ان کے جذبات، ان کے محسوسات اور ان کے پیغام کے بنیادی عناصر ہیں وہ ہمیشہ جوان رہے اور ان کے سخن کی حرارت اور ان کی پیغام کا خروش نوجوانوں کے خون کی روانی کو تیز کرتا اور انہیں تسخیر ذات اور تسخیر کائنات دونوں پر آمادہ کرتا رہا۔

اقبال کی شاعری کا پہلا دور فطری طور پر مطالعے اور تیاری کا دور ہے ان کی جوانی کی شاعری میں وہ سوز اور وہ سیمابی کیفیت موجود ضرور ہے جسے ان کے نظام سخن کی اولین خصوصیت کہنا چاہیئے اور جو آگے چل کر ان کی فکری اور الہامی شاعری پر سر بسر چھا گئی لیکن ابھی اس نے وہ تلاطم انگیز اور آفاق گیر رنگ اختیار نہیں کیا تھا جو شعر اقبال کے درمیانی اور آخری دور سے نسبت رکھتا ہے اقبال کا شعر شباب خود نگری اور خود شناسی کی ایک لطیف و جمیل کیفیت سے سرشار ہے اور جب شاعر اس کیفیت سے ذرا چونکتا ہے تو وہ اپنے گرد و پیش پر بھی ایک نظر غائر ڈال لیتا ہے لیکن اس کے پاس اپنے مطالعہ نفسی کے اظہار اور ایک دل دردمند کی پکار کے سوا کوئی پیغام نہیں ہے۔ نوجوان شاعر اپنے نوجوان ہمعصروں کو فطری طور پر کوئی پیغام دینے سے ہچکچاتا ہے اور یہ اس کی حقیقت پسندی عظمت کا ایک قطعی نشان ہے۔

نوجوان اقبال جب اس جوہر طبیعت اور اس انداز تربیت سے آراستہ ہو کر تکمیل تعلیم کے سلسلے میں یورپ گیا تو اسے دیار و امصار مغرب میں اپنی فکر کو جلا دینے اور اپنے ذہنی افق کو وسیع تر کرنے کے بیشمار مواقع میسر آئے ان کا حیرت انگیز اثر یہ ہوا کہ وہ یورپ کی جاجانہ وطن پرستی سے بیزار ہو گیا اور ملت اسلامیہ کی وحدت کا تصور اپنی پوری شدت سے اس کے ذہن میں ابھرا اور اس کو یقین ہو گیا کہ ہندی مسلمان بلکہ مسلمانان عالم کی نجات کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ وہ پھر سے خالص اسلامی اقدار کو زندہ کریں اور مذہب کے ظاہری ڈھانچے سے نہیں بلکہ روح اسلام سے زندگی کی انفرادی فلاح اور اجتماعی کامیابی کے وہ اصول کشید کریں جن کی صداقت پر خود گردش زمانہ نے بیسیوں بار اپنی مہر ثبت کی ہے

چنانچہ یورپ کے دوران قیام میں ان کے جن خیالات نے شاعری کا جامہ پہنا وہ اکثر و بیشتر اسی تاثر کے سرمایہ دار ہیں پنجاب کے بابائے اردو یعنی شیخ عبدالقادر مرحوم بھی انہیں دنوں انگلستان میں بیرسٹری کے تعلیم کے لئے مقیم تھے مگر وہ اقبال سے ایک سال پہلے مراجعت فرمائے وطن ہو گئے تھے ان کی واپسی کے کچھ بعد اقبال نے انہیں ایک مراسلہ منظوم لکھا جو ان کے پہلے مجموعہ کلام "بانگ درا" میں تمام و کمال موجود ہے یہ مراسلہ بظاہر ایک دوست کا خط ہے مگر درحقیقت اس انقلاب روحانی اور درد پنہانی کا طوفان ہے جو ان ایام میں شاعر کے دل درد آشنا میں کروٹیں لے رہا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق
سنگ امروز کو آئینہ فردا کر دیں
رخت جاں، بت کدۂ چین سے اٹھائیں اپنا
سب کو محو رخ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقف تماشا کر دیں
شمع کی طرح جییں بزم گہہ عالم میں
خود جلیں، دیدہ اغیار کو بینا کر دیں

ملت اسلامیہ کے ایک حساس نوجوان کے سینے میں جس قسم کے احساسات تلاطم برپا کر رہے تھے یہ نظم لطیف ان کی ایک ہلکی سی آئینہ داری کرتی ہے لیکن یہاں بھی اقبال نے خود شناسی اور خود نگری سے صرف ایک قدم آگے بڑھایا ہے اور اپنی بے تابیوں میں محض ایک رفیق دور افتادہ کو شریک کیا ہے اپنے معاصر نوجوان کو اس نے کوئی پیغام نہیں دیا، اگرچہ اپنے سینے کو چیر کر دکھانے سے ایک خاموش دعوت ہم نفسی ضرور دی ہے۔

پھر وہ دور آیا جب اقبال نے پختہ سالی منزل میں قدم رکھا اور وہ روائتی حق حاصل کیا جس کی رو سے شاعر یا مفکر اپنے احساسات براہ راست اپنے مخاطبین تک پہنچا سکتا ہے۔ اقبال اس بارے میں بہت وضع دار تھے اور انہوں نے اس حق کا اس وقت تک استعمال نہیں کیا جب تک وہ نوجوانی کے دائرے سے نکل کر سچ مچ پختہ سالی کی منزل میں داخل نہیں ہو گئے اور دیکھئے یہاں بھی ان کے مخاطبین محض نوجوان تھے یہ سچ ہے کہ انہوں نے ہر جگہ نوجوان کا نام لے کر اس سے خطاب نہیں کیا۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ان کے موضوعات سخن میں سے کوئی ایسا موضوع نہیں جس کا تعلق نوجوان، جواں مرد مرد جواں ہمت اور اس کے عمل اور اس کے کردار سے نہ ہو بہرحال موجودہ مقالے میں، میں نے اپنے آپ کو محض ان مثالوں تک محدود رکھا ہے جن میں نوجوان سے بدیہی طور پر خطاب ہے یا اس کی طرف صاف صاف اشارات ہیں۔

بانگ درا کی مشہور نظم "خطاب بہ نوجوان اسلام" میں اقبال نے ایک منفیانہ رنگ اختیار کیا ہے اور وہ نوجوانان اسلام کی پیش نظر زبوں کا تلخ جائزہ لے کر خاموش ہو گئے ہیں ابھی انہوں نے اسے صرف شرمسار کیا ہے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گلے سے نہیں لگایا اور نہ اس منزل گم کردہ کی طرف اشارہ کیا ہے جسے از سر نو حاصل کرنا اس کے لئے مقدر ہو چکا تھا مگر ہمیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ شاید یہ احساس ندامت اقبال کے مخاطب نوجوان کے لئے ایسا ہی ضروری تھا جیسا اس کے بعد پیدا ہونے والا جذبہ یقین مفرسایا کہ

کبھی اے نوجوان مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں، خلاق آئینِ جہانداری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارہ
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

اقبال نے ملت اسلامیہ ہندیہ کو تین جدید تصورات دیئے تھے خودی، فقر اور عشق، یا یوں کہئے کہ ان تین الفاظ کے لئے نئے مفاہیم دیئے تھے یہاں ان تصورات کی تفصیل و تفسیر کا نہ موقع ہے نہ وقت لیکن مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ احساسِ خودی سے مراد عظمتِ انسانی اور اس کی خوبیوں، ذمہ داریوں اور بلندیوں کا احساس تھا۔ فقر کے معنی مسکنت نہیں ہے بلکہ وہ سیر چشمی اور بے نیازی کی کیفیت ہے جو ادنیٰ دنیوی فوائد کی طرف سے بعض سعید ارواح میں پیدا ہو جاتی ہے۔ عشق کا مطلب کسی مہ جبیں بُت ہندی کا عشق نہیں ہے، بلکہ وہ گرمیِ دل اور جذبہ کامل ہے جس سے مالا مال ہو کر انسان ایک بلند، روشن اور پاکیزہ زندگی بسر کرتا ہے اور بڑے بڑے کارنامے ایسی آسانی سے انجام دے پاتا ہے کہ وہ ادنیٰ حساب دانی جسے عقل کہا جاتا ہے حیران و سرگشتہ رہ جاتی ہے ان تصورات کو اقبال نے مومن کی ذات گرمی میں یک جا کر دیا ہے۔

شاعر مشرق نے بالارادہ اور بالقصد اپنے جدید تصورات نوجوان اسلام ہی کے سامنے پیش کئے اور ان کی تفصیل و تشریح کے سلسلے میں انہی کو اپنا مخاطب بنایا۔ ایک داخلی ثبوت اس دعویٰ کا یہ بھی ہے کہ بیشتر وہ خوبیاں جو اقبال ان تصورات کے مجموعے یعنی مردِ مومن میں مرکوز کرتا ہے وہ محض جوانوں ہی میں پائی جا سکتی ہیں مثلاً سوز، عمل، وسعت بے کرانی، پروانہ، بے نیازی، قوت اور بے خوفی ایک اور ثبوت اس نظریے کا یہ ہے کہ اقبال کا محبوب پرند شاہین جو فقر، بلند نگاہی قوت اور گرمیِ خون کا پیکر ہے شباب ہی کی صفات کا مظہر ہے۔

اقبال کی شاعری کا تیسرا دور ایک بڑی حد تک اس کی الہامی شاعری کا دور ہے اس دور میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس پر یہ منکشف ہو چکا تھا کہ اس کے وطن کے نوجوانوں پر عنقریب ہی نیابتِ الٰہی کی ذمہ داریاں عائد ہونے والی ہیں اپنے کلام میں وہ بار بار اس آنے والی عظمت کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

دنیا کی امامت کے فرائض کے لئے شاعر مشرق فرسودگانِ بے عمل اور پیرانِ بے مصرف کی تلاش میں نہیں تھا بلکہ اس کی تمام تر امیدیں اور تمنائیں جوانوں ہی سے وابستہ تھیں وہ ان میں سے ہر صاحبِ دل نوجوان کو ملت کے مقدر کا ستارہ قرار دیتا ہے اور اسی کیفِ یافت میں پکار اٹھتا ہے کہ ؎

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

آخر میں ایک مست عمل نوجوان کی ایک تصویر بھی دیکھتے چلئے ؎

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضربِ کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غالب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری
عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہو ہمہ سونم
کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کرّاری
نگاہ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو
یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

قرآن مجید اور جدید سائنس

امتہ الکریم بیگم اسماء آمنہ

قرآن انسان چاند

سائنس دان افراد کے جن سنسنی خیز کارناموں نے آج دنیا میں تہلکہ برپا کر دیا ہے۔ اگرچہ وہ انتہائی حیرت انگیز ہیں۔ مگر اس شخص کے لئے یہ واقعات غیر متوقع نہیں کہ جس نے قرآن پاک کا مطالعہ اس گہری نظر سے کیا ہو کہ جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دے رکھا ہے۔

اس لئے کہ سائنس کی جتنی تحقیقات اور جو جو ایجادات آج تک کی جا چکی ہیں یا کی جانے والی ہیں، بلا مبالغہ ان سب کی پیشین گوئیاں کسی نہ کسی پیرائے میں قرآن مجید کے اندر پہلے سے موجود ہیں۔ چاند پر انسانوں کے پہنچ جانے سے دوسرے مذہب والے البتہ بڑا منا رہے ہیں۔ مگر قرآن کو دیکھتے ہوئے تو سائنس کی ہر ایجاد و تحقیق گویا قرآنی آیات کی جیتی جاگتی تفسیر بن کر سامنے آتی چلی جا رہی ہے

قطع نظر اس کے کہ قرآن میں تسخیر کائنات سے متعلق چھ سو آیات سے زیادہ ہیں۔ لیکن یہاں تو صرف چاند سے متعلق چند آیات کا حوالہ دیا جائے گا۔ باقی انشاء اللہ پھر کسی وقت۔ وھو ہذا۔

آسمان کے سیاروں اور چاند کے اندر جانے کی کوششیں

قرآن پاک کے پارہ ۲۷ سورت ۵۵ آیات ۳۳-۳۵ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

"اے جنوں اور انسانوں کے گروہ اگر تم سے ہو سکتا ہے۔ کہ زمین اور آسمان کے اقطار میں سے نکل کر آگے کو نفوذ کر جاؤ تو کر کے دیکھ لو۔ تم نہ کر سکو گے۔ سوائے "سلطان" کی مدد کے (اس کوشش میں) تم پر آگ کے انگارے اور پگھلی ہوئی دھاتیں برسیں گی اور کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے گا"۔

چنانچہ خلا بازوں نے جب تک خاص الخاص قسم کے مضبوط راکٹ ایجاد نہیں کر لئے تھے اس وقت تک خلا نوردی میں ان ہی مذکورہ بالا خطرات کا خوف لاحق تھا اور اب چاند کے راستے میں تو نہیں مگر چاند میں پہنچ کر وہاں ٹھہرنے کے لئے ان ہی خطرات کے پیش نظر چاند کے غاروں میں جا کر رہنے کی تجاویز پر غور کیا جا رہا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں سب سے پہلے تو یہ اشارہ قابل غور ہے۔ کہ انسان زمین اور آسمان کے اقطار سے نکل کر نہ جا سکیں گے۔ مگر ہاں سلطان کے ذریعے سے (قرآن کی زبان میں "سلطان" راکٹ کو کہا گیا ہے جس کا بیان آگے آیا ہے) اس آیت میں یہ دونوں باتیں آ گئیں کہ باہر نکل کر جانے سے انکار بھی ہے اور سلطان کے ذریعے سے چلے جانے کا امکان بھی ہے امکان تو اپنے نظام شمسی کے سیاروں میں جا سکنے کا ہے۔ کہ راکٹوں کی قوت اور تیزی کے ذریعے سے زمین کی کشش کے دائرے سے باہر نکل جائیں گے۔ اور انکار اس لئے ہے کہ اپنے نظام شمسی سے باہر نکل کر کسی اور سیارے میں پہنچنا ناممکن ہے اس لئے کہ ہر وہ سیارہ جس میں جانے کا انسان ارادہ کرے گا وہ ہماری زمین کی طرح کسی نہ کسی اور سورج کے گرد گھوم رہا ہو گا۔ اور حالیہ تحقیق کی رو سے ہر ایک سورج یعنی ستارہ ہمارے راکٹ سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ہمارے سورج سے دور ہٹتا جا رہا ہو گا۔ اس لئے کسی دوسرے نظام کے سیاروں میں ہمارا جا پہنچنا ناممکن ہے۔ سائنس نے تحقیق کر لیا ہے کہ کائنات کے تمام ستارے بڑی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے دور دور ہٹتے چلے جا رہے ہیں اور آسمان پھیلتا جا رہا ہے۔

لیکن اس پر بھی غور کیجئے کہ سائنس والوں کو تو آج اس حقیقت کا پتہ چلا ہے مگر قرآن حکیم آج سے چودہ سو سال پہلے ہی فرما چکا ہے۔ پارہ ۲۷، سورت ۵۱ آیت ۴۷ میں ہے کہ "ہم نے اپنی خاص قدرت اور حکمت سے آسمان کو بنایا اور یقیناً ہم اس کو پھیلاتے جا رہے ہیں" آیت مبارک کے الفاظ یہ ہیں

والسماء بنینٰھا بأید وانا لموسعون۔

قرآن کے ایسے انکشاف کو پڑھ کر فرط حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ قرآن نے یہ سب کچھ اس زمانے میں فرمایا کہ جب آسمان کو ایک ٹھوس چھت اور ستاروں کو اس میں میخوں کی طرح جڑا ہوا سمجھا جاتا تھا

اور وہ "سلطان" کہ جس کے ذریعے سے انسان اپنی زمین اور نظام شمسی کے دوسرے سیاروں سے نکل کر جا سکیں گے اس لفظ "سلطان" کے معنی ہیں زبردست طاقت، انتہائی تیزی پوری قدرت، صحیح رہنمائی اور بادشاہت اور یہ اشارہ ان راکٹوں کا ہے۔ کہ جن کی تیاری میں بادشاہتوں کے خزانے ہی صرف ہو رہے ہیں اور وہ راکٹ زبردست طاقت اور انتہائی تیزی کے ساتھ ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی طوفان خیز رفتار سے زمین کی کشش کے دائرے سے باہر نکل جاتے ہیں۔ اور ان میں سوار خلا باز پوری قدرت اور مہارت سے ان کو چلاتے رہتے ہیں اور زمین کے اوپر بیٹھے ہوئے دوسرے سائنس دان ان راکٹوں کی ایسی صحیح رہنمائی کرتے ہیں کہ اگر ایک

سیکنڈ کا بھی فرق پڑ جائے تو تباہی لازمی ہو جائے۔

مذکورہ بالا آیت میں دوسرا لفظ "اقطار" قابل غور ہے اقطار جمع ہے "قطر" کی جس کے معنی ہیں گول کرّوں کا دل یا موٹائی۔ جیسے کہ ہماری زمین کا قُطر آٹھ ہزار میل اور محیط ۲۵ ہزار میل مانا گیا ہے۔ پرانے ترجموں میں "اقطار" کا ترجمہ زمین آسمان کے کنارے لکھا ہوا ملے گا۔ شاید اسی مناسبت سے کہ بظاہر دونوں کے کنارے ملے ہوئے ہی نظر آتے ہیں اور اُس زمانے میں چاند سیاروں کے اندر جانے کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔

تیسرا لفظ ہے "نفوذ" کر جانا یعنی ایک چیز کی کوشش سے نکل کر دوسری چیز کی کشش سے اس میں کھنچے چلے جانا جیسے کہ زمین کی کشش کے دائرے سے نکل کر چاند کی کشش سے اسکی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ آج تو اس حقیقت سے بچہ بچہ واقف ہو گیا ہے مگر خیال کیا جائے چودہ سو سال پہلے کا کہ جب قرآن نے ایسے اشارے فرمائے۔

مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ "سلطان" کے لفظ میں راکٹ کی شکل صورت کا اشارہ بھی پوشیدہ ہے۔ وہ اس طرح کہ لفظ سلطان کے مادّے یا رُوٹ کے حروف س، ل۔ ط سے ایک لفظ سلطنہ مشتق ہوتا ہے۔ (بنتا ہے) جس کے معنی ہیں وہ خاص طور سے پتلا اور لمبا "تیر" کہ جو بہت ہی تیزی کے ساتھ اپنی کمان سے نکل کر عین نشانے پر جا لگتا ہے۔

یہ ہے قرآن کا کمال! کہ اس کے ایک ایک لفظ میں معانی کے گویا دریا بھرے ہیں۔ تبھی تو زمین سے لے کر آسمان تک اور ازل سے لے کر ابد تک کے تمام حالات قرآن کے اندر سما گئے ہیں اور اسی لئے قرآن کی وہ مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ جس میں فرمایا کہ ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے واسطے حرفوں کے ادل بدل اور ہیر پھیر سے کائنات کی کل حقیقتیں بیان کر دی ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بہت سے لوگ اس طرح سمجھنے کی کوشش نہیں، (پارہ ۱۵ ا۔ سورت ۱۷ ا۔ آیت ۸۹) اور کیا یہ تعجب کا مقام نہیں کہ اس قسم کی آیات کو پڑھ کر بھی اہلِ قرآن کے دلوں میں آیات متشابہات کو سمجھنے کا شوق نہ پیدا ہوا ایسے ہی فرمان ربّی سے متاثر ہو کر میں نے وہ مذکورہ بالا چھوٹی سی کتاب لکھنے کی جرأت کی ہے۔ اتنا اور عرض کر دوں کہ اس کیلئے کسی لمبی چوڑی علمیت کی ضرورت نہیں بلکہ عربی ڈکشنری کی مدد سے یہ سب کچھ سمجھ میں آسکتا ہے۔

اسی لئے پرانے ترجموں کے مقابلے میں کسی نئے ترجمے کو غلط خیال کر لینا مناسب نہ ہوگا

عربی لغات کو دیکھنے سے انسان محو حیرت ہو جاتا ہے کہ عربی میں ایک ایک چیز اور ایک ایک معاملے کے لئے کتنے زیادہ معنی ہیں بلکہ اکثر مختلف معنی بھی ہیں۔ جائیے۔ غور ہے کہ ایک ترجمہ کرنے والا آخر ایک لفظ کے لئے کتنے معنی لکھ سکتا ہے ظاہر ہے کہ بہت سے معنوں میں سے وہ کوئی ایک معنی ہی اپنے انتخاب سے لکھ دے گا۔ جب کہ دوسرا ترجمہ لکھنے والا اسی لفظ کے کوئی دوسرے معنی لکھ دے گا اور اپنی اپنی جگہ پر دونوں معنی صحیح ہوں گے۔ اسی لئے پرانے ترجموں کے مقابلے میں کسی نئے ترجمے کو بغیر تحقیق کے غلط خیال کر لینا مناسب نہ ہوگا۔ بلکہ خود ڈکشنری سے ان الفاظ کی تحقیق کی جائے۔ اور یہ بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ جس لغات سے مدد لی جائے وہ "لغات القرآن" کے نام سے نہ ہو کہ اس میں تو وہی معنی لکھے ہوئے ہوں گے جو پرانے ترجموں میں پہلے لوگ لکھ گئے ہیں اور نہ کوئی ایسی ڈکشنری ہو کہ جیسی آج کل غیر ممالک میں دھڑا دھڑ لغات لکھی جا رہی ہیں۔ بلکہ سابقہ زمانے کی کوئی مشہور اور مستند لغات العربی ہو یا کم از کم [redacted] قسمت کی مفتاح اللغات ہی ہو جو پاکستان میں آسانی سے مل جاتی ہے۔

اب چاند کے بارے میں ایک اور انکشاف سنیئے

پارہ ۳۰، سورت ۸۴، آیات ۱۸-۱۹ - ۲۰ میں فرمایا -

والقمر اذا اتسق ٥ لتركبن طبقاً عن طبق -

اس کا مفہوم یہ ہے اور ہم کو چاند کی اس حالت کی قسم جبکہ وہ تسقے کا کام کرتا ہے - اور کرے گا۔ تم لوگ "اس کے ذریعے سے) ضرور ایک طبقے سے دوسرے میں سواری پر سوار ہو ہو کر جاؤ گے پھر ان کو کیا ہو گیا کہ وہ ایمان نہیں لاتے "(یعنی خدا کی قدرتوں کے اتنے جلوے دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے - بلکہ خدا پر تو ایمان لے ہی آئیں گے - ایمان تو اس قرآن پر لانا چاہیئے کہ جس نے چودہ سو سال پہلے یہ سب کچھ بتادیا تھا)

مذکورہ آیات میں دو لفظ قابل غور ہیں - تسق اور لترکبن تسق کے معنی ہیں اس نے سقے کا کام کیا یا کریگا - یہ لفظ مشتق ہے "تسقیہ" سے جس کے معنی ہیں "پانی بھرنے کا پیشہ" اسقا کے معنی ہیں پانی پلانا اور مشکیں بھر بھر کر پانی کو اتارنا چڑھانا اور ساقی کے نام اور کام سے تو سبھی واقف ہیں - پس تسق کا لفظ چاند کے لیے فرما کر اللہ تعالیٰ نے ایک تو یہ ثابت کیا ہے کہ سمندر کا مدّوجزر چاند کی کشش سے ہوتا ہے دوم یہ امید دلادی ہے کہ آئندہ چاند میں جا کر رہنے والوں کو وہاں پانی مل جائے گا - بلکہ پانی مل جانے کا اشارہ تو صاف طور سے پارہ (۲۹) سورت ۲، آیت ۱۶-۱۷ میں بھی فرمایا ہے - جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ان لوگوں نے ہمارے قانون کے مطابق عمدہ طریق سے کام کیا تو ہم ان کو وہاں بہت افراط سے پانی پلائیں گے تاکہ پھر ان کا امتحان لیں اور ان کو تعجب میں مبتلا کریں"

تسق کے بعد دوسرا لفظ ہے لترکبن جس کے معنی ہیں تم لوگ ضرور کسی مرکب کے راکب بن کر ایک طبقے سے دوسرے میں جاؤ گے (یعنی کسی قسم کی سواری پر سوار ہو کر) پرانے ترجموں میں اس آیت کے معنی یہ لکھے ہیں کہ تم جنت کے ایک درجے سے دوسرے میں چڑھو گے (حالانکہ جنت کے درجوں میں چڑھنے کے لئے سواری کی کیا ضرورت ہے - وہ تو ایسا محاورہ ہوگا جیسے کہ ایک کلاس سے دوسری میں چڑھ جانا) لہٰذا یہ اشارہ تو چاند اور سیاروں کے سفر کا ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر فرما دیا کہ دوسرے سیاروں میں جانے کے لئے چاند درمیانی اسٹیشن بنے گا چنانچہ سائنسدان بھی یہ تجویز کر رہے ہیں -

چاند میں بہت دلچسپ کھیل کھیلے جائیں گے

پارہ ۳۰، سورت ۹۱، آیت ۲ میں فرمایا والقمر اذا تلٰھا

اور ہم کو چاند کی اس حالت کی قسم جب کہ اس میں داخل ہو کر آپس میں نہایت دلچسپ کھیل کھیلے جائیں گے" (یہاں پر نہ صرف کھیل کھیلنے کا ذکر ہے - بلکہ کم از کم دو فریقوں کا اس کھیل میں حصہ لینے کا اشارہ ہے اور یہ تمام اشارے ایک لفظ تلٰھا میں پوشیدہ ہیں - جو عربی ڈکشنری کے مطالعے سے معلوم ہو سکتے ہیں - چنانچہ موجودہ نسلوں کی خوش نصیبی سے یہ کھیل ۲۱ جولائی ۱۹۶۹ء سے شروع ہو گئے اور خدا کی قدرت کہ پہلے پہل دو ہی انسان چاند پر اُترے اور جب یہ کھیل بڑے پیمانے پر شروع ہوں گے تو غالباً فی الحال امریکہ اور روس دونوں ملک ہی مدِمقابل ہوں گے -

چاند کے سفر کے ایک اور تجربے سے قرآن کی صداقت کا اظہار

وہ یہ کہ خلا نوردوں کا بیان ہے کہ جب ان کا راکٹ چاند سے واپسی پر زمین کی پُرزور کشش کی وجہ سے ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی قیامت خیز رفتار سے زمین کی طرف کھنچا چلا آرہا تھا تو اس وقت تیز تر رفتار سے راکٹ سراپا آگ کا گولہ بن گیا تھا۔ مگر سائنس کا کمال کہ نہ راکٹ اور اس کے تار اور پُرزے جلے اور نہ خلا بازوں کو آنچ آئی۔ اس لئے کہ خلا نورد تو ایسا لباس پہنے ہوئے تھے کہ جس پر آگ اثر نہ کرے۔ اور راکٹ کو کچھ ایسی ترکیب سے بنایا جاتا ہے کہ وہ مجسم آگ بن کر بھی سلامت رہے۔

اب سنئے کہ اس کے بارے قرآن پاک کیا فرمایا ہے پارہ ۱۴ سورت ۱۶ آیت ۸۱ میں فرمایا "اے انسانو! اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے ایسے سرابیل بنوا دیگا۔ کہ جو تم کو جلنے سے بچالیں گے، لفظ سرابیل میں کئی باریکیاں پوشیدہ ہیں اس کے معنی پورا لباس اور جسم کو چھپانے کا سامان ہے اور اس لفظ کے مادے کے حروف س۔ ر۔ ب یعنی سرب کے معنی ہیں، جنگلی اور شکاری جانوروں کے چھپ کر بیٹھنے کا "بھٹ"، یعنی جہاں سے شیر چیتے وغیرہ موقعہ پاکر شکار پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ اور یہ صاف اشارہ ان راکٹوں کا ہے کہ جن میں خلا نورد محفوظ بیٹھے رہ کر موقعے پر چاند اور سیاروں میں کود جائیں گے اس کے علاوہ "سرب" یعنی "بھٹ"، کا اشارہ اس امر پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ چاند میں جا کر ٹھہرنے والے چاند کے غاروں یا بھٹوں میں جا کر ٹھہریں گے تاکہ شہاب ثاقب کے حملوں سے محفوظ رہ سکیں جو وہاں ہر وقت گرتے رہتے ہیں اور قرآن پاک کی اُس مذکورہ آیت کی تصدیق کرتے رہتے ہیں کہ وہ آسمان کے اقطار میں پہنچ کر تم پر آگ اور پگھلی ہوتی دھاتیں برسیں گی،،

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ
لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا
وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ
سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

"بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور دن رات کی تبدیلیوں میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ جو ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور زمین کی آفرینش پر غور و فکر کرتے ہیں اے ہمارے رب تو نے یہ (سب کچھ) بیکار پیدا نہیں کیا تو پاک ہے۔ ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے۔"

آج کا طالب علم

نعیم احمد زبیر

طلبہ قومی زندگی میں ہمیشہ بھرپور حصہ لیتے آئے ہیں اور لئے جا رہے ہیں قومی معیار بلند کرنے اپنا حق حاصل کرنے اور قوم کو تباہی و بربادی سے بچانے کے لئے طلبہ نے کبھی اپنے خون کی پرواہ کی ہے اور نہ جان کی۔ ہر ظلم کے سامنے وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہوتے رہے ہیں، لاٹھیوں کی بارشیں، گولیوں کی آوازیں، آنسو گیس کے بم اور حکمران طبقے کے مظالم بھی ان کی آواز کو دبانے میں ناکام رہے ہیں۔ قوم کے لئے اپنا سبھی کچھ قربان کر دینے والے طبقہ میں آجکل بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کے حقوق کی کسی جگہ بھی پاس داری نہیں ہو رہی۔ ان کی قربانیوں کو سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس طبقہ کو مختلف گروپوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ کسی پر سوشلسٹ کا دھبہ لگایا جا رہا ہے اور کسی کو اسلام پسند کے لیبل سے سجایا جا رہا ہے، ان کے اسلاف کے اوصاف سے ان کو بیگانہ کرنے کے لئے مختلف حربے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ان کو مذہب سے دور کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں تاکہ وہ ذلت و رسوائی کے اس گڑھے میں جا گریں جس سے ان کا نکلنا ناممکن ہو جائے

طلبہ کے اندر بڑھتی ہوئی بے چینی کو قوم کے ایک طبقے نے بجا طور پر محسوس کیا سو ہم نے پچھلے دنوں اسی طبقے کے چند افراد سے ملاقات کر کے طلبہ کے متعلق مندرجہ ذیل سوالات کئے

سوال ۱ پاکستانی طلبہ میں مذہب کی بنیادیں کس قدر گہری ہیں ؟ اور وہ کون سے عوامل ہیں جو ان کو مذہب سے بے گانگی پر مجبور کر رہے ہیں

سوال ۲ طلبہ کس حد تک سیاست میں دلچسپی لیتے ہیں اور انہیں کس حد تک لینی چاہئے۔

سوال ۳ طلبہ میں پائی جانے والی بے چینی کی کیا وجوہات ہیں۔؟

سوال ۴ طلبہ میں "ادبی رجحانات" کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔؟

سوال ۵ سائنس اور آرٹس میں سے کن طلبہ کے رجحانات ادب کی طرف زیادہ ہے۔؟

جناب مشتاق سہیل

نگران "اخبار علم"
روزنامہ "مشرق"
کراچی

پاکستانی طلباء اور مذہب کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اس بنیاد پر طلباء کی قسمیں کی جاسکتی ہیں، ہم نے طلباء میں ہمیشہ مذہبی اقدار کا احترام اور اخلاقی اقدار کو اپنانے کا جذبہ موجزن دیکھا ہے

وہ اپنی زندگی کی الجھی راہیں سنوارنے کے لئے ادھر ادھر دیکھنے کی بجائے مذہب سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، پھر انہیں یہ بات پریشان نہیں کرتی کہ چودہ سو سال پرانے ان نظریات نے انہیں کیا دیا ہے اور ان سے کیا چھن گیا ہے

ان کے مقابلے میں تعلیمی اداروں میں پڑھنے والوں کی ایک اور قسم ان دنوں خاصی "معروف" ہے انہیں بھی لوگ طلباء کے ہی نام سے یاد کرتے ہیں مگر ہم انہیں "طالبان علم" کہا کرتے ہیں

ان کے بارے میں ہم نے کبھی یہ بات نہیں سوچی کہ یہ مذہبی اقدار کے پابند ہوں گے ان میں "آزادی" کے جذبات اتنے رچ بس گئے ہیں۔ کہ بعض حالتوں میں تو اپنے آپ سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں۔ انہیں ہم "طلباء" کی بجائے "اسٹوڈنٹس" کے نام سے بھی پکارا کرتے ہیں۔ ان میں ہمیشہ لیڈری کا تاج اس کے سر پر سجتا ہے جو زیادہ سالوں تک فیل ہوتا رہے اور مذہب کو گالیاں دینے میں مہارت تامہ رکھتا ہو۔

سوال کے دوسرے حصے میں مذہب سے بیگانگی کی بجائے اگر مذہبی شعار سے بیگانگی کی وجوہات معلوم کرلی جائیں۔ تو ہم اس کے جواب میں شاعر مشرق کو بطور سند پیش کردیں گے کہ۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

"طلباء اور سیاست" ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے

ہمارے نزدیک ضروری ہے کہ طلباء دوران تعلیم سیاست کے نشیب و فراز سے آگاہ ہوں۔ دنیا بھر کے سیاسی مفکرین کو پڑھیں ان کی سیاسی بصیرت کا مطالعہ کریں جب عملی زندگی میں قدم رکھیں۔ تو اپنے انہی تجربات کو عملی روپ دیں اور ان سے فائدہ اٹھا کر مثبت انداز فکر کے ذریعے قوموں کی قسمت بدل ڈالیں۔ ایسے مرد میدان بنیں جن کے بارے ہی کہا گیا ہے کہ۔

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ ہر دم
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

ادب قدرت کا عطیہ ہے جسے چاہے ودیعت کردے۔ ہر حساس انسان میں ادبی رجحانات ہوتے ہیں اور ہمارے خیال میں ہر اچھا طالب علم حساس اور باشعور ہوتا ہے عمر کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر ہر شخص کچھ نہ کچھ لکھتا ہے۔ کچھ نہ کچھ کہتا ہے اس دور میں وہ جو کچھ تخلیق کرتا ہے "ادب برائے ادب" کے نظریہ کو مدنظر رکھتے ہوئے تخلیق کرتا ہے اگر طالب علم "پروپیگنڈا" کی روش کو نہ اپنالیں۔ تو قوموں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا کرتے ہیں

ادب کسی کی میراث نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں یہ عطیہ قدرت ہے وہ جسے چاہے دے۔ حساس طبیعتیں سائنس یا آرٹس کے طبقوں سے متعلق نہیں ہوتیں۔ احساس زندہ ہو تو آدمی کسی بھی لائن سے متعلق ہو۔ بہتر ادب تخلیق کرسکتا ہے

سائنس کے طلباء جب اپنے احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے ادب کی تخلیق کریں گے تو تاثر اور کرب کے لحاظ سے وہ کسی طور آرٹس کے طلباء سے پیچھے نہ رہیں گے۔

سنجیدہ، متین اور صحیح معنوں میں طالب علم کے لئے بے چینی اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب اس کے تعلیم کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جائیں

تعلیمی اداروں کی تجارتی ذہنیت، اساتذہ کا تدریسی فرائض انجام نہ دینا۔ غیر معیاری نظام تعلیم۔ صرف اسناد عطا کرنے والا طریقۂ امتحان اور سب سے بڑھ کر بیکاری کے دوزخ میں جلنے کا کرب طلباء کو پریشان کئے رہتے ہیں، طلبہ نے ہمیشہ انہی مسائل کے حل کے لئے آواز اٹھائی ہے

جناب ظفر صاحب

نگرانِ "طلبا کا صفحہ"

روزنامہ "حریت"

کراچی

میں نے آپ کے تمام سوالات غور سے پڑھے اور جب جواب لکھنے بیٹھا تو احساس ہوا کہ آپ نے مجھے ہر طرف سے گھیرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر پہلے سوال کا جواب دیتا ہوں تو دوسرا سوال گریبان پکڑ لیتا ہے۔ تیسرے سوال سے دامن بچا کر نکلنے کی کوشش کرتا ہوں تو چوتھا سوال اچک کر سامنے آجاتا ہے۔ لہٰذا فرار کی راہیں مسدود پا کر جواب دے رہا ہوں۔

سوال نمبر ۱ :۔ میرا یہ ایمان ہے کہ مسلمان اوّل و آخر مسلمان رہتا ہے۔ چنانچہ آپ کے سوال کا یہ جز پڑھنے کے بعد (کہ "کیا وہ مذہب سے دور نہیں ہٹتے جا رہے ؟ اور کونسے عوامل ان کو ایسا کرنے پر مجبور کر رہے ہیں ؟) مجھے یوں محسوس ہوا ہے جیسے آپ مجھ سے اثبات میں جواب چاہتے ہیں، اگر مجھے آپ اجازت دیں تو یہ لقمہ اگل کر عرض کروں کہ میں قطعی آپ کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ ہمارے نوجوان طلبہ مذہب سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

سوال نمبر ۲ :۔ طلبہ کا سیاست میں حصّہ لینا کوئی ایسی بری بات بھی نہیں بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ نوجوانی کے دور ہی کی دلچسپیاں آگے چل کر راہنمائی کرتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ خیال فرسودہ ہے کہ طلبہ کو سیاست میں حصّہ نہیں لینا چاہئے۔ ہاں حد سے بڑھتی ہوئی عملی دلچسپی پر آپ کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن ووٹ کے حق کے ساتھ ساتھ عمر کی جو قید لگائی گئی ہے اس سے عملی دلچسپی لینے والوں کی خاصی حوصلہ شکنی ہو جاتی ہے۔

سوال نمبر ۳ :۔ "ادبی رجحانات" سے آپ کی کیا مراد ہے ؟ میرے والد صاحب کے زمانے میں "ادبی رجحانات" کچھ تھے، دادا صاحب کے زمانے میں کچھ اور۔ نتیجتاً اس فکری تغیر کا یہ نکلا کہ میں نے اپنے دادا کی جمع کی ہوئی بیش قیمت عربی و فارسی کی کتابیں کوڑیوں کے مول بیچ دیں، اور "آدم جی و داؤد" ادبی انعام یافتہ کتابوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ آنے والی نسل ان کے ساتھ وہی سلوک کرے گی جو میں نے دادا کی کتابوں کے ساتھ کیا تھا۔

اگر آپ کا اشارہ "طلبہ میں پائے جانے والی ادبی رجحانات" کے متعلق ہے تو میں یہ کہوں گا کہ آج کی نسل میں یہ جراثیم بہت کم ہیں۔

سوال نمبر ۴ :۔ سائنس اور آرٹس مضامین سے متعلق طلبہ سے مجھے واسطہ پڑتا رہتا ہے میں نے ایک لمحے کے لئے بھی محسوس نہیں کیا کہ سائنس گروپ سے تعلق رکھنے والے طالب علم شعر سمجھنے لکھنے یا ادبی تحریریں جنم دینے کی صلاحیتوں سے محروم ہے یا آرٹس والے اس معاملے میں حاوی ہیں۔ دونوں میں ادبی دلچسپی ایک جیسی ہے

میں یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ اس معاملے میں کوئی کلیہ نہیں بنا سکتے۔

سوال نمبر ۵ :۔ دنیا کے حالات اس قدر تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں کہ نئی نسل اور پرانی نسل کے درمیان رابطہ منقطع ہو کر رہ گیا ہے ایسے میں بے چینی تو پیدا ضرور ہو گی۔

۔آج کا طالب علم نوجوان اور کسی موضوع پر بولے یا نہ بولے مگر وہ ہر قسم کے FRUSTRATION پر بہت کچھ بول سکتا ہے لیکن میرا سوال آپ سے یہ ہے کہ کیا آپ اس مسئلے پر اس کی بات سننے کی تاب رکھتے ہیں ؟ ۔

جناب ثروت جمال اصمعی

نگران "طلبا کا صفحہ"
روزنامہ "جسارت"
کراچی

(۱) میرے خیال میں یہ کہنا درست نہیں کہ پاکستان کے طلبہ مذہب سے دور ہوتے جا رہے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی کے دو سو سالہ دور غلامی میں اسلام کے بارے میں ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں جو معذرت خواہانہ رجحان پیدا ہوا تھا، وہ بڑی تیزی سے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اور ایک مکمل نظام زندگی اور انسانیت کے مسائل کے واحد حل کی حیثیت سے، اسلام پر نئی نسل کا اعتماد بڑھ رہا ہے۔ یہ اعتماد محض خوش عقیدگی اور جذباتیت کی بنا پر نہیں بلکہ میدانِ عمل میں سرمایہ داری اور سوشلزم کی ناکامی کو دیکھ لینے اور اسلام کے اصولوں کی معقولیت کو جان لینے کے بعد پیدا ہوا ہے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کے طلبہ میں مذہب کی بنیادیں گہری ہوتی جا رہی ہیں۔

اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت کالج یونینوں کے انتخابات میں اسلامی ذہن و فکر رکھنے والے اور اسلامی نظام تعلیم کے علمبردار طلبہ کی بڑے پیمانے پر کامیابی ہے۔ گذشتہ چند سالوں کے نتائج کا تقابل کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ذہن رکھنے والے طلبہ کا تناسب ہر سال نمایاں طور پر بڑھتا جا رہا ہے۔

البتہ پوری قوم کی طرح طلبہ کے اندر بھی ایک طبقہ ایسا ضرور ہے جو اسلام کے بجائے بیرونی نظریات کا پرستار ہے۔ اس عنصر کی سربراہی بڑے بڑے سرمایہ داروں اور لکھ پتیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام سے ان کی دوری کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ اسلامی نظام کے قیام کی صورت میں انہیں اپنے بہت سے مفادات سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اور غریبوں کا خون چوسنے اور ان کو لوٹنے کھسوٹنے کی آزادی حاصل نہ رہے گی۔ ان کے ساتھ تھوڑے بہت وہ طلبہ بھی ہیں جو ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے ہیں، لیکن اگر اسلامی فکر رکھنے والے طالب علم ان میں خلوص اور حکمت کے ساتھ مسلسل کام کریں تو انہیں اسلامی قوتوں کی صف میں لایا جا سکتا ہے۔

(۲) "طلبہ سیاست میں کس قدر حصہ لیتے ہیں؟" سوال ایسا ہے کہ بحیثیت مجموعی سارے طلبہ کے بارے میں کوئی ایک جواب نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس معاملے میں طلبہ کے اندر مختلف گروہ پائے جاتے ہیں۔

۔ پہلا گروہ تو وہ ہے جسے اپنے گردوپیش کی کوئی فکر ہی نہیں۔ دنیا میں اور ملک کے اندر خواہ کچھ ہوتا رہے وہ اپنی دلچسپیوں اور اپنے آپ میں مگن رہتا ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو سیاست میں بڑھ چڑھ کر اور بلا ضرورت حصہ لیتا ہے۔ تعلیمی اداروں کے عام مسائل کو بھی سیاسی رنگ دے ڈالتا ہے۔ کھلم کھلا سیاسی جماعتوں سے اپنی وابستگی ظاہر کرتا ہے جلسوں اور جلوسوں میں اپنے پسندیدہ رہنماؤں کی تصویریں آویزاں کرتا ہے۔

اویزاں کرتا ہے۔ ان کے نام کے نعرے لگاتا ہے۔ ان سے سیاسی اختلاف رکھنے والے رہنماؤں کو گالیاں دیتا ہے اور ان کے پتلے جلاتا ہے۔

تیسرا گروہ، وہ ہے جو سیاست سے دلچسپی کے معاملے میں اعتدال سے کام لیتا ہے۔ عملاً سیاست میں حصہ نہیں لیتا، اور لیتا ہے تو صرف اس وقت جب ملک کا مفاد اس کا متقاضی ہو، ملک کی سالمیت اور اسلام کی عظمت پر آنچ آنے کا خطرہ ہو یا نظریۂ پاکستان کی جڑیں کھودنے کی سازش کی جا رہی ہو اور اسے ناکام بنانے کے لئے طلبہ کی طاقت کا میدان میں آنا ضروری ہو۔

میرے خیال میں پہلے دونوں گروہوں کا طرز عمل غلط اور تیسرے گروہ کا درست ہے۔ ملک کا سب سے باشعور طبقہ ہونے کی حیثیت سے، سیاسی صورت حال سے طلبہ کی یکسر عدم واقفیت بھی افسوسناک ہے، اور سیاسی رہنماؤں کا آلۂ کار بن کر حصول تعلیم کے مقصد کو ترک کر کے، میدان سیاست میں کود پڑنا بھی تشویشناک ہے۔ صحیح طرز عمل یہی ہے کہ اس معاملے میں اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے اور یہ اصول سامنے رہے کہ اگر پاکستان اور نظریۂ پاکستان اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ طلبہ

جاسکے ورنہ نہیں۔

(۳) طلبہ پوری قوم سے الگ کوئی طبقہ نہیں ہیں۔ اس لئے ان میں بے چینی کی ایک قسم کی وجوہات تو وہ ہیں جنہوں نے پوری قوم میں بے چینی پیدا کر رکھی ہے، مثلاً: غیر یقینی سیاسی صورت حال، رہنماؤں کی دھاندلی اور بے جا ضد جس نے پاکستان کی سالمیت کے لئے خطرہ پیدا کر دیا ہے، بھرگرانی، رشوت، ہر شعبہ میں بڑھتی ہوئی بد دیانتی اور نوکر شاہی کا تسلط وغیرہ۔ دوسری قسم کی وجوہات وہ ہیں جو صرف علمی دنیا سے متعلق ہیں، یعنی تعلیمی مسائل۔ چند بڑے بڑے مسائل جو طلبہ میں بے چینی کا سبب بنے ہوئے ہیں، یہ ہیں: فیسوں کی زیادتی، مہنگی نصابی کتب، ایک اجنبی زبان کا ذریعہ تعلیم ہونا، کتابوں کی نایابی، تعلیمی ماحول کا فقدان، پیشہ ورانہ درس گاہوں میں نشستوں کی شدید قلت، اساتذہ کے مسائل جن کی بنا پر وہ طلبہ پر پوری توجہ نہیں دے پاتے، مخلوط تعلیم جس کی وجہ سے تعلیمی ادارے بداخلاقیوں کا اڈہ بن گئے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر بے مقصد نظام تعلیم۔

ہمارا نظام تعلیم، طالب علموں کو، کوئی اعلیٰ نصب العین اور بلند مقصد نہیں دیتا۔ تعلیم صرف ڈگری اور ڈگری ملازمت کے لئے حاصل کی جاتی ہے۔ چنانچہ کسی مقصد کے نہ ہونے کی وجہ سے طالبعلم آوارہ فکری کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہی چیز بے چینی کا سب سے بڑا سبب بنتی ہے۔

(۴) میں سمجھتا ہوں، آج کا طالب علم اپنے نصابی موضوعات کے علاوہ ہر موضوع پر بلا تکان گھنٹوں بول سکتا ہے۔

(۵) لگتا تو ایسا ہی ہے اور اس کی وجہ شائد یہ ہے کہ ہمارے ہاں طلبہ کو اپنے پیشے اور مضمون کے انتخاب کی آزادی حاصل نہیں اس کا فیصلہ والدین اور رشتہ دار کرتے ہیں۔ یہ ایک عام خیال ہے کہ معاشی اعتبار سے سائنس کی تعلیم زیادہ مفید ہے چنانچہ اکثر اصلاحیت طالب علم سائنس کے شعبے میں بھیجے جاتے ہیں اور جن طلبہ کو سائنس کے کالجوں میں داخلہ نہیں مل پاتا انہیں مجبوراً آرٹس کا رخ کرنا پڑتا ہے اس طرح ادبی صلاحیتیں رکھنے والے بہت سے طالب علم سائنس میں چلے جاتے ہیں لیکن اپنے فطری رجحان کی بنا پر ادب سے اپنا تعلق برقرار رکھتے ہیں۔

جناب علی شاہین صاحب

نگران طلبا کا صفحہ

روزنامہ جنگ

کراچی

(۱) یہ کہنا غلط ہے کہ ہمارے وطن عزیز پاکستان کے طلبہ مذہب سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے جو اسلام کے نام پر قائم ہوئی ہے اس کی تاسیس میں دین اسلام کا بڑا دخل ہے، ہمارے وطن کا ہر باشندہ اپنے مذہب سے گہرا لگاؤ رکھتا ہے اور وہ وقت آنے پر جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اس کا بین ثبوت ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ سے ہمیں ملتا ہے لیکن اب چند برسوں سے ہمارا ملک جس صورت حال کا سامنا کر رہا ہے اس کی روشنی میں اگر طلبہ کی کیفیت کا جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مستقبل میں ہمارے ملک کے نہ صرف طلبہ کو بلکہ ہر باشندے کو ان حالات کا سامنا کرنا پڑے گا جس سے ازمنہ وسطیٰ میں صلیبی جنگوں کے خاتمے کے بعد اہل یورپ دوچار ہوئے تھے، ملک کے تعلیمی اداروں میں مذہبی علوم بالخصوص عربی زبان کی زبوں حالی لائق طلبہ کی حق تلفی اور ان کی جگہ غیر مستحق طلبہ کے لئے ترقی کے مواقع، سیاسی مفاد اور ذاتی اغراض و مقاصد کی حصولی کے لئے "دین و مذہب کو خطرہ ہے" اور "پسند و ناپسند" وغیرہ کے نعرے والوں نے پورے ملک کے عوام کے ذہنوں پر اثر ڈالا ہے اس قسم کے نعرہ بازی دارالسلام کے بجائے دارالحرب میں مناسب معلوم ہوتی ہے ان عوامل نے باشعور طلبہ پر گہرا اثر ڈالا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہمارے طلبہ مذہب کے خلاف ہیں یا اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

(۲) طلبہ قوم کے مستقبل کے معمار ہیں ـــ ان پر بھاری ذمہ داریاں

عائد ہونے والی ہوتی ہیں۔ اس لئے طلبہ کو سیاست میں ضرور حصہ لینا چاہئے۔ تاکہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی ٹھیک طور پر کر سکیں۔ سیاست میں ان کو اعتدال پسندی اور میانہ روی اختیار کرنی چاہئے۔ تعلیم کا مقدم خیال رکھنا چاہئے۔ اور سیاست میں حصہ لینا دوسرے نمبر پر ہونا چاہئے، طلبہ ہمیشہ سے قوموں کی امیدوں کے سہارے ہوئے ہیں۔ قوم کا یہی طبقہ ہے جو کبھی مصر میں استعماری قوتوں کے خلاف برسرپیکار ہو جاتا ہے اور کبھی "علی گڑھ" جیسی تحریک کو ابھارتا اور چلاتا ہے۔ یہ طلبہ ہی تھے جنہوں نے دور ایوبی کا خاتمہ کیا، آج کے طلبہ دو متضاد گروپوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ ایک اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتا ہے اور دوسرا "اسلام پسند" کہلواتا ہے، دونوں گروپوں کا کوئی طالب علم اپنے نظریہ کے متعلق اچھی طرح واقفیت نہیں رکھتا۔ سوشلسٹ سوشلزم سے ناواقف ہے اور اسلام پسند کا دامن اسلامی علوم کے ذخیروں سے خالی ملتا ہے۔

نظام تعلیم، کتابوں کی کمی، بے روزگاری، مہنگائی، افسران بالا کا ناانصافانہ رویہ، ایسی ہی دوسری ہزاروں باتیں ہیں جنہوں نے طلبہ کے اندر بے چینی کی شدید لہر پیدا کر دی ہیں۔ طلبہ اپنے مستقبل سے ناامید ہو چکے ہیں، لائق محنتی اور مستحق طلبہ کی بجائے واقف حضرات کو فوقیت دی جاتی ہے۔ سفارش اور خوش آمد نے اچھے اچھے طلبہ پر ترقی کے دروازے بند کر دیئے ہیں، سفارش اور خوش آمد کی ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ ایک سال جامعہ کے ایک ڈیپارٹمنٹ کی سربراہ کی اولاد فرسٹ آتی ہے اور گولڈ میڈل حاصل کرتی ہے، اگلے سال اسی ڈیپارٹمنٹ کے دوسرے سربراہ کی صاحبزادی فرسٹ آتی ہیں، ایک ملازمت کے سلسلے میں جب ان کا انٹرویو لیا گیا تو دونوں میں سے کوئی بھی ٹھیک جواب نہ دے سکیں، اگر انہوں نے اپنی محنت اور ذہانت سے گولڈ میڈل لیا ہوتا تو اپنے ہی مضمون کے بارے میں کئے گئے سوالات میں فیل نہ ہوتیں..... ایسے ہی ہزاروں

حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو سائنس کے طلبہ کا رجحان ادب کی طرف زیادہ ہے

(۳) آج کے طلبہ میں ادبی رجحانات نہ ہونے کے برابر ہیں اسے زندگی کے دوسرے ہنگاموں سے فرصت ملے تو ادب طرف رجوع کرے۔

(۴) طلبہ کی جو تعداد ادب کی طرف زیادہ مائل ہے اگر حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سائنس کے طلبہ کا ادب کی طرف زیادہ رجحان ہے اس کے بعض وجوہات ہیں، جن میں ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک میں میٹرک تک دی جانے والی تعلیم میں سائنس اور آرٹس میں بالکل فرق نہیں ہے ایک سائنس کا طالب علم لیبارٹری میں کام نہ کرنے کی وجہ سے آرٹس کے طالب علم کے برابر ہوتا ہے۔ دوسری وجہ والدین بھی ہیں، جو مجبور کرتے ہیں کہ ان کی اولاد سائنس پڑھے۔ سائنس میں آنے کے باوجود اپنے ذوق کی تسکین کے لئے ادب کی طرف ان کی دلچسپی بڑھتی رہتی ہے۔

(۵) طلبہ میں بے چینی کے کئی اسباب ہیں۔ جن میں سے حق تلفی، اسکول و کالج کی انتظامیہ کا رویہ، خوش آمدید ہیں ان کے علاوہ نقص

واقعات ہمارے ملک میں پیش آتے ہیں۔ ان کے ردعمل کے طور پر طلبہ میں بے یقینی اور بے چینی پھیلتی جاتی ہے، تعلیم مکمل کر لینے پر بھی جب نوکری نہیں ملتی تو آدمی پاگل ہو جاتا ہے، مہنگائی اور ناقص نظام تعلیم اور غیر یقینی مستقبل نے طلبہ کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔

آج کا طالب علم فلموں پر سب سے زیادہ بول سکتا ہے۔ محمد بن قاسم، طارق بن زیاد کے بہادری کے قصوں کی بجائے وہ یہ زیادہ جانتا ہے کہ محمد علی اور وحید مراد نے فلاں فلم میں فلاں قسم کے بال بنائے تھے، انہیں چاند بی بی کے متعلق کچھ علم نہیں ہے، مگر زیبا، روزینہ اور دیبا کے گھریلو حالات تک کا علم رکھتے ہیں۔

مولانا مودودی سے پانچ سوال

(ریگزین شیکسٹش)

سوال :- "انٹر کے امتحان میں پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت میں شرکت کے لئے درخواست کے ہمراہ فوٹو ارسال کرنا لازمی ہے۔ پھر کیا ایسی صورت میں فوٹو کھنچوانا جائز ہے؟ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمعیت العلماء نے اس صورت کو جائز فرمایا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ فعل جائز کیونکر ہو سکتا ہے۔

جواب :- اس معاملہ میں مجھے مولانا کفایت اللہ صاحب کے فتوے سے اتفاق ہے۔ فوٹو کھنچوانا اگرچہ ناجائز ہے لیکن جہاں کسی حقیقی تمدنی نقصان سے بچنے یا کسی حقیقی تمدنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے فوٹو کا استعمال ناگزیر ہو، وہاں صرف اس ضرورت کی حد تک ایسا کرنا جائز ہے امتحانات کے سلسلہ میں چونکہ یہ تجربہ ہوا ہے کہ بہت سے لوگ دھوکہ دے کر کسی دوسرے شخص کو اپنے بجائے امتحان دینے کے لئے بھیج دیتے ہیں اس لئے درخواست کے ساتھ تصویر لگانا لازم کیا گیا ہے۔ اس ضرورت کو تصویر کے سوا کسی دوسرے طریقے سے پورا کرنا مشکل ہے اور دھوکے اور فریب کا سد باب بھی ضروری ہے۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے تصویر کھچوانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح میرے نزدیک پاسپورٹ، تفتیش

جرائم، طبی تحقیقات وضروریات۔ جہاد اور ناگزیر تعلیمی اغراض کے لئے بھی فن تصویر کا استعمال درست ہے۔ اصول فقہ کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ الضرورات تبیح المحظورات۔ یعنی انسان کی حقیقی ضروریات کے لئے وہ چیزیں جائز ہو جاتی ہیں جو بجائے خود ناجائز ہیں۔

سوال:۔ قرآن وحدیث میں بہت سے ایسے امور بیان ہوئے ہیں ال کی تحقیقات غلط قرار دیتی ہیں۔ اس صورت میں ہم قرآن وحدیث کو مانیں یا علمی تحقیق کو؟ مثلاً:۔

ا۔ قرآن کہتا ہے کہ نوع انسانی آدمؑ سے پیدا ہوئی، بخلاف اس کے علمائے دور حاضر کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کے کنبہ سے تعلق رکھتا ہے اور بندروں اور بن مانسوں سے ترقی کرتے کرتے آدمی بنا ہے۔

ب)۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ آفتاب حرکت کرتا ہے، مگر سائنس کہتی ہے کہ نہیں، آفتاب ساکن ہے۔

ج:۔ اسی طرح بادلوں میں جو کڑک اور چمک ہوتی ہے، اس کے متعلق اسلام کی رائے یہ ہے کہ یہ بادلوں کو ہنکاتے ہوئے فرشتوں کے کوڑے چمکتے اور آواز نکلتے ہیں، حالانکہ زمانۂ حال کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ رعد اور برق کا ظہور بادلوں کے ٹکرانے سے ہوتا ہے۔

د:۔ "کانا دجال" کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں مقید ہے تو آخر وہ کونسی جگہ ہے، آج تو دنیا کا کونہ کونہ انسان نے چھان مارا ہے، پھر کیوں کانے دجال کا پتہ نہیں چلا۔

جواب:۔ مجھے تو اپنی پچیس سالہ علمی تحقیق وتفتیش کے دوران آج تک ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی ہے کہ سائنٹیفک دائرہ سے انسان نے کوئی حقیقت ایسی دریافت کی ہو جو قرآن کے خلاف ہو۔

البتہ سائنس دانوں یا فلسفیوں نے قیاس سے جو نظریے قائم کئے ہیں ان میں سے متعدد ایسے ہیں جو قرآن کے بیانات سے ٹکراتے ہیں۔ لیکن قیاسی نظریات کی تاریخ خود اس بات پر شاہد ہے کہ ایک وقت جن نظریات کو حقیقت سمجھ کر ان پر ایمان لایا گیا دوسرے وقت خود وہی نظریات ٹوٹ گئے اور آدمی ان کے بجائے کسی دوسری چیز کو حقیقت سمجھنے لگا۔ ایسی ناپائیدار چیزوں کو ہم یہ مرتبہ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ قرآن کے بیانات سے ان کی پہلی ٹکر ہوتے ہی قرآن کو چھوڑ کر ان پر ایمان لے آئیں۔ ہمارا ایمان اگر متزلزل ہو سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جب کہ کسی ثابت شدہ حقیقت سے، یعنی ایسی چیز سے جو تجربہ ومشاہدہ سے ثابت ہو چکی، قرآن کا کوئی بیان غلط قرار پائے۔ مگر جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں، ایسی کوئی چیز آج تک میرے علم میں نہیں آئی ہے۔

اب فرداً فرداً ان چیزوں کے متعلق کچھ عرض کر دوں جنہیں آپ نے مثال میں پیش کیا ہے:۔

ل۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اس وقت تک محض نظریہ ہے، ثابت شدہ حقیقت

ب:۔ غالباً آپ ابھی تک انیسویں صدی کے سائنس کو سائنس سمجھ رہے ہیں جبکہ آفتاب متحرک نہ تھا، موجودہ سائنس کا آفتاب تو اچھی خاصی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہا ہے۔

ج:۔ قرآن مجید کی کوئی آیت میرے علم میں ایسی نہیں ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ بادلوں میں چمک اور کڑک بجلی کے بجائے فرشتوں کے کوڑے برسانے سے ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید میں بارش کا جو عمل (Process) بیان کیا گیا ہے وہ بالکل ٹھیک ٹھیک موجودہ زمانہ کی سائنٹیفک تحقیقات کے مطابق ہے اور اتنا جدید (Up to Date) ہے کہ پچھلی صدی کے وسط تک جو معلومات انسان کے پاس بارش کے متعلق تھیں ان کی بنا پر بعض لوگوں کو ان آیات کی تفسیر میں سخت پریشانی پیش آتی تھی جن میں بارش کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

د:۔ "یہ کانا دجال" وغیرہ تو افسانے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ ان چیزوں کو تلاش کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت بھی نہیں۔ عوام میں اس قسم کی جو باتیں مشہور ہوں، ان کی کوئی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے اور ان میں سے کوئی چیز اگر غلط ثابت ہو جائے تو اس سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

سوال:۔ اس زمانہ میں انگریزی دوائیں جو عام طور پر رائج ہیں ان میں سے ہر رقیق دوا میں الکوہل (جو ہر شراب) شامل ہوتا ہے۔ میں ان سے اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن عرض یہ ہے کہ تحریم خمر کے متعلق جو حکم قرآن میں ہے اس میں اگر خمر مطلب "نشہ آور چیز" لیا جائے تو دوا میں الکوہل اتنا کم ہوتا ہے کہ نشہ نہیں کرتا اور نہ کوئی اس مقصد سے پیتا ہے نہ اس ترکیب سے اس کو اپنے لئے حلال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں باریک بینی کی جائے تو ڈبل روٹی میں بھی آٹے کا خمیر اٹھنے پر کچھ الکوہل بن جاتا ہے، اور شربت جو بوتلوں میں آتے ہیں ان میں بھی کچھ الکوہل ضرور بن جاتا ہے۔ بلکہ الکوہل تو باسی انگوروں میں بھی بنتا ہے۔ اگر ان صورتوں میں کوئی وجہ حرمت نمودار نہیں ہوتی تو آخر صرف دوا ہی کے اندر الکوہل کی شمولیت کیوں اتنی زیادہ قابل توجہ ہو؟ نیز اگر باعتبار لغت خمر کا مطلب انگوری شراب لیا جائے تو الکوہل انگوری شراب نہیں ہے۔ اس لئے انگریزی دوائیں ناجائز نہ ہونی چاہئیں۔ لیکن علماء نے اس زمانہ میں جب ایسی ادویات سامنے نہیں تھیں ایسے سخت فتوے دے دیئے کہ آج انہیں مختلف مواقع پر چسپاں کرنے سے بڑی مشکل پیش آ رہی ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ آج کل یونانی ادویہ مرکبہ کا خالص حالت میں دستیاب ہونا بہت ہی دشوار ہے۔ خمیرہ مروارید میں بڑے سے بڑا متقی دوا ساز بھی مروارید کی جگہ صدف ملا دیتا ہے۔ نیز جانیں بچانے کے لئے جب لوگ زیادہ تر ترقی یافتہ انگریزی طب اور جراحی کے ماہرین کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہیں تو آخر وہ یونانی ادویہ تجویز کر کے تو دینے سے رہے!

جواب! خمر اگرچہ انگوری شراب کو کہتے، لیکن اس سے مراد ہر نشہ آور چیز ہے چنانچہ خمر کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ "الخمر ما خامر العقل"، یعنی ہر وہ چیز خمر ہے جو عقل کو ڈھانک لے اور شریعت میں یہ اصول بیان گیا ہے کہ "ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام" یعنی جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے اس کی کم مقدار بھی حرام ہے۔ یہ کم مقدار کی حرمت نشہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ کم مقدار استعمال کر لینے سے نفس کے اندر کی وہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے، یا کم از کم کمزور پڑ جاتی ہے، جو حرام چیز کے لئے نفس میں موجود ہوتی ہے۔

پھر یہ بات علمی طریق پر معلوم ہے کہ تمام شرابوں میں وہ اصل چیز جو نشہ پیدا کرنے والی ہے، الکوہل ہی ہے۔ اس لئے کسی صورت میں اس کا استعمال جائز تو نہیں ہو سکتا۔ البتہ ایسے حالات میں جب کہ فن طب کی ترقی مسلمانوں کے ہاں ایک مدت سے بند ہو چکی ہے۔ اور جدید زمانہ میں اس فن کی تمام ترقیات ایسے لوگوں کے ہاتھوں ہوئی ہیں جو حرام و حلال کی تمیز سے خالی ہیں اور انہوں نے نئے زمانے کی بیشتر مؤثر دواؤں میں الکوہل کو ایک اچھا محلل پاکر دواسازی میں بکثرت استعمال کیا ہے، افراد کے لئے اضطرار کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ شریعت کسی انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتی کہ وہ اپنی صحت اور اپنی زندگی کی حفاظت کے صرف ان ذرائع پر انحصار کرے جو کسی خاص زمانہ تک ہوئے ہوں اور اس زمانہ کے بعد دریافت ہونے والے ذرائع خواہ کتنے ہی کارگر اور مفید ہوں، ان سے اجتناب کر کے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے۔ اس لئے افراد تو اضطرار کی بنا پر ان ذرائع میں حرمت کا سبب موجود ہوتے ہوئے بھی ان کو اپنی زندگی کی حفاظت کے لئے استعمال کر سکتے ہیں، لیکن تمام مسلمان بحیثیت مجموعی اس وقت تک اس گناہ کے ذمہ دار بنتے رہیں گے جب وہ فن طب اور دواسازی کی جدید ترقیات کو مسلمان بنا لینے کی اجتماعی کوشش نہ کریں۔

جدید فن طب اور دواسازی کو مسلمان بنانے سے میری مراد یہ ہے کہ اس فن کی تمام موجودہ اور آئندہ ترقیات کو اسلام کے اصول اخلاق کا پابند بنایا جائے اور دواسازی کے تمام موجودہ اور آئندہ ترقی پذیر ذرائع کو اسلامی حدود کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ یہ کام جب تک اجتماعی سعی سے نہ ہوگا۔ افراد تو اضطرار کی وجہ سے معاف ہوتے رہیں گے، لیکن جماعت کے نامۂ اعمال میں مسلسل گناہ لکھا جاتا رہے گا۔ اجتماعی گناہوں کی یہی خاصیت ہے کہ ان کی وجہ سے افراد کے لئے انفرادی طور پر اضطرار کی حالت پیدا ہو جاتی ہے، مگر اجتماعی طور پر پوری جماعت گناہ گار قرار پاتی ہے

سوال:- کیمیاوی آلات کے ذریعہ سے اگر مرد کا نطفہ کسی عورت کے رحم میں پہنچا دیا جائے اور اس سے اولاد پیدا ہو، تو یہ عمل مضرت سے خالی ہونے کی وجہ سے مباح ہے یا نہیں؟ اور اس عمل کی معمولہ زانیہ شمار کی جائے گی، اور اس پر حد جاری ہوگی یا نہیں؟ اس امر کا خیال رکھئے کہ آج کل کی فیشن دار عورت مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے۔ وہ اگر سائنٹفک طریقوں سے اپنے حصہ کا نسل بڑھانے کا فریضہ ادا کرے تو پھر اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ امریکہ میں اس طرح پیدا ہونے والی اولاد کو از روئے قانون جائز اولاد تسلیم کیا گیا ہے۔"

جواب:- آلات کے ذریعہ سے استقرار حمل کا جواز تو دور رہا، میرے لئے اس عمل کا تصور ہی ناقابل برداشت ہے کہ عورت گھوڑی کے مرتبے تک گرا دی جائے۔ آخر انسان کی صنف اناث اور حیوانات کی مادہ میں کچھ تو فرق رہنے دیجئے۔ حیوانات میں بھی اللہ تعالیٰ نے توالد و تناسل کا جو طریقہ مقرر کیا ہے وہ نر اور مادہ کے اجتماع کا طریقہ ہی ہے۔ یہ انسان کی خود غرضی ہے کہ وہ گھوڑیوں کو اپنے نروں سے ملنے کا لطف حاصل نہیں

کرنے دیتا اور ان سے صرف نسل کشی کا کام لیتا ہے۔ اب اگر انسان کو اپنی "مادہ" کے ساتھ بھی یہی برتاؤ شروع ہو جائے تو اس کے انسانیت کی انتہائی تذلیل کے ہیں۔

آج کی "فیشن دار" عورت جو مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے، دراصل اس کی فطرت کو مصنوعی فکری و صنعتی ماحول نے مسخ کر دیا ہے ورنہ اگر وہ صحیح انسانی فطرت پر ہوتی تو اس قسم کی گری ہوئی خواہش کو دل میں جگہ دینا تو درکنار، ایسی تجویز سننا بھی گوارا نہ کرتی۔ عورت محض نسل کشی کے لئے نہیں ہے بلکہ عورت اور مرد کا تعلق انسانی تمدن کی قدرتی بنیاد ہے۔ فطرت الٰہی نے عورت اور مرد کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ ان میں مودت اور رحمت ہو، حسن معاشرت ہو، مل کر گھر بنائیں، گھر سے خاندان اور خاندان سے سوسائٹی انشوونما حاصل کرے۔ اس مقصود کو ضائع کر کے عورت کو محض نسل کشی کا آلہ بنا دیا۔ فلیغیرن خلق اللہ (اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو بدل دینے) کا مصداق ہے جسے قرآن ایک شیطانی فعل قرار دیتا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا طریقہ مقرر فرمایا ہے لہٰذا وہی اولاد جائز اولاد ہے جو قید نکاح میں پیدا ہو۔ اسی سے وراثت اور نسب کی تحقیق ہوتی ہے۔ اگر آلہ کے ذریعہ سے بچہ پیدا کیا جائے تو اسے حلالی نہیں کہا جا سکتا۔ شرعی نقطۂ نظر سے وہ حرامی ہی کہا جائے گا۔ نیز اس کا سلسلۂ آبائی منقطع ہو گا اور وہ باپ کے ورثہ سے محروم رہے گا جو قطعی طور پر اس کی حق تلفی ہے۔

پھر غور تو کیجئے کہ جس بچے کا کوئی باپ نہ ہو اس کی تربیت کا ذمہ دار کون ہو گا؟ صرف ماں؟ کیا یہ ظلم نہیں کہ خدا نے انسان کے بچہ کے لئے ماں اور باپ، چچا اور ماموں، دادا اور نانا وغیرہ لوگوں کی صورت میں جو مربی پیدا کئے ہیں ان میں سے آدھے ساقط کر دیئے جائیں اور وہ صرف سلسلۂ مادری پر منحصر رہ جائے؟ کیا دنیا سے پدری محبت، پدرانہ ذمہ داریوں اور پدرانہ اخلاق کو فنا کر دینا انسانیت کی کوئی خدمت ہے؟ کیا یہ انصاف ہے کہ عورت پر ماں ہونے کی ذمہ داری قائم رہے۔ مگر مرد ہمیشہ کے لئے باپ ہونے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے؟

پھر اگر یہی سلسلہ چل پڑا تو ایک روز عورت مطالبہ کرے گی کہ کوئی ترکیب ایسی ہونی چاہئے کہ انسان کا بچہ میرے رحم میں پرورش ہونے کے بجائے "امتحانی نلیوں" میں پالا جائے۔ یعنی انسان کیمیاوی معمل میں پیدا ہونے لگے۔ اور جب تک یہ حالت پیدا نہیں ہوتی، عورت چاہے گی کہ اسے صرف بچہ جننے کی تکلیف دی جائے، اس کے بعد ماں کے فرائض انجام دینے کے لئے وہ تیار نہ ہو گی۔

یہ صورت جب رونما ہو گی تو انسانی بچے اسی طرح "کثیر پیداواری" (Mass Production) کے اصول پر فیکٹریوں میں ڈھل کر نکلیں گے جس طرح اب جوتے اور موزے نکلتے ہیں۔ یہ انسانیت کے تنزل کا آخری مقام ہے، اس کا اسفل السافلین ہو گا۔ ان "کارخانہ ہائے نسل کشی" سے انسان نہیں بلکہ دو ٹنگے جانور پیدا ہوں گے، جن میں انسانی شرف اور پاکیزہ انسانی جذبات و احساسات کی خوبو برائے نام بھی نہ ہو گی اور سیرت کا وہ تنوع ناپید ہو گا جو تمدن کی رنگا رنگ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔ ان کارخانوں سے کسی ارسطو اور ابن سینا، کسی غزالی اور رازی، کسی ہیگل اور کانٹ کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ میرے خیال میں تو وہ مادہ پرستانہ تہذیب لعنت بھیجنے کے قابل ہے جس کے زیر سایہ ایسی تجویزیں انسان کے دماغ میں آتی ہیں۔ اس قسم کی تجویزوں کا انسانی دماغوں میں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس تہذیب نے انسان کے ذہن میں خود انسانیت کے تصور کو نہایت پست اور ذلیل کر دیا ہے۔

سوال:۔ "ریڈیو ایک ایسا آلہ ہے، جو ایک شخص کی آواز کو سینکڑوں میل دور پہنچا دیتا ہے، اسی طرح گراموفون کے ریکارڈوں میں انسانی آواز کو محفوظ کر لیا جاتا ہے اور پھر اسے خاص طریقوں سے دہرایا جا سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی امام ہزاروں میل کے فاصلے سے بذریعہ ریڈیو امامت کرائے یا کسی

امام کی آواز کو گراموفون ریکارڈ میں منضبط کر لیا ہو اور اسے دہرایا جائے، تو کیا ان آلاتی آوازوں کی اقتدا میں نماز کی جماعت کرنا جائز ہے۔

جواب :- ریڈیو پر ایک شخص کی امامت میں دور دراز کے مقامات کے لوگوں کا نماز پڑھنا اصولاً صحیح نہیں ہے۔ اس کی وجوہ پر آپ غور کریں تو خود آپ کی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

امام کا کام محض نماز پڑھانا ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک طرح سے مقامی جماعت کا رہنما ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ اپنے مقام کے لوگوں سے شخصی ارتباط قائم کرے۔ ان کے اخلاق، معاملات اور مقامی حالات پر نظر رکھے۔ اور حسب موقع وضرورت اپنے خطبوں میں یا دوسرے مفید مواقع پر اصلاح وارشاد کے فرائض انجام دے، یہ الگ بات ہے کہ مسلمانوں کی دوسری چیزوں کے ساتھ اس ادارہ میں بھی اب انحطاط رونما ہوگیا ہے۔ لیکن بہرحال نفس ادارہ کو تو اپنی اصلی صورت پر قائم رکھنا ضروری ہے۔ اگر ریڈیو پر نمازیں ہونے لگیں یا گراموفون سے امامت وخطابت کا کام لیا جانے لگے تو امامت کی اصل روح ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گی۔

نماز دوسرے مذاہب کی عبادتوں کی طرح محض "پوجا" نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی امامت سے شخصیت کو خارج کر دینا اور اس میں "مشینیت" پیدا کرنا دراصل اس کی قدر وقیمت کو ضائع کر دینا ہے۔

علاوہ بریں اگر کسی مرکزی مقام سے کوئی شخص ریڈیو یا گراموفون کے ذریعہ سے امامت وخطابت کے فرائض انجام دے اور اور مقامی امامتوں کا خاتمہ کر دیا جائے تو یہ ایک ایسی مصنوعی یکسانیت ہوگی جو اسلام کی جمہوری روح کو ختم کر دے گی اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ کو ترقی دے گی۔ یہ چیز ان نظامات کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے جن میں پوری پوری آبادیوں کو ایک مرکز سے کنٹرول کرنے اور تمام لوگوں کو ایک لیڈر کا بالکلیہ تابع بنا دینے کا اصول اختیار کیا گیا ہے جیسے فاشزم اور کمیونزم۔ لیکن اسلام ایک مرکزی امام یا امیر کے اقتدار کو ایسا ہمہ گیر بنانا نہیں چاہتا کہ مقامی لوگوں کی باگ ڈور بالکل اس کے ہاتھوں میں چلی جائے اور خود ان کے اندر اپنے مفاد کو کو سوچنے، اپنے معاملات کو سمجھنے اور ان کو طے کرنے کی صلاحیت ہی نشو ونما نہ پا سکے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرن خیر القرون میں "امام" محض پجاری کی حیثیت نہیں رکھتے تھے جن کا کام چند مذہبی مراسم کو ادا کرا دینا ہو بلکہ وہ مقامی لیڈر کے طور پر مقرر کئے جاتے تھے۔ ان کا کام تعلیم وتزکیہ اور اصلاح تمدن ومعاشرت تھا اور مقامی جماعتوں کو اس غرض کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ بڑی اور مرکزی جماعت کی فلاح وبہبود میں اپنی قابلیتوں کے مطابق حصہ لیں۔ ایسے اہم مقاصد ریڈیو سیٹ یا گراموفون سے کیونکر پورے ہو سکتے ہیں۔ آلات انسان کا بدل کبھی نہیں ہو سکتے، صرف مددگار ہو سکتے ہیں۔ ان وجوہ سے میں سمجھتا ہوں کہ "مشینی امامت" اسلام کی روح کے بالکل خلاف ہے۔

سوال :- "میرے ایک فوٹو گرافر دوست کا خیال ہے کہ اسلام نے تصویر کے متعلق جو امتناعی حکم دیا ہے وہ فوٹو پر عائد نہیں ہوتا، بالخصوص جب کہ فحش منظر کا فوٹو نہ لیا جائے، کیا اس حد کو قائم رکھتے ہوئے فوٹو گرافی کو پیشہ بنایا جا سکتا ہے؟ قومی لیڈروں، جلسوں اور جلوسوں کی تصویریں لینے میں کیا حرج ہے"؟

جواب :- فوٹو کے متعلق اصولی بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ اسلام جاندار چیزوں کی مستقل شبیہ محفوظ کرنے کو بالعموم روکنا چاہتا ہے کیونکہ انسانی تاریخ کا طویل تجربہ ثابت کرتا ہے کہ یہ چیز اکثر فتنہ کی موجب بنی ہے۔ اب چونکہ اصل فتنہ صورت کا محفوظ ہونا ہے لہٰذا اس سے بحث نہیں کی جائیگی۔ کہ اس کو کس طریقہ سے محفوظ کیا جاتا ہے۔ طریقہ خواہ سنگ تراشی کا ہو یا موقلم یا عکاسی کا یا کوئی جو آئندہ ایجاد ہو، بہرحال وہ ناجائز ہی رہے گا کیونکہ یہ سارے طریقے اصل فتنہ کا سبب بننے میں یکساں ہیں۔ پس فوٹوگرافی اور مصوّری میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اور مبالغت چونکہ جاندار اشیاء کی تصویروں کی ہے، اس لئے تمام تصویریں حرام رہیں گی، خواہ وہ فحش ہوں یا غیر فحش۔ البتہ فحش تصویر میں ایک وجہ حرمت کی اور بڑھ جاتی ہے۔

اس عام حکم کے اندر اگر کوئی استثناء ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جہاں تصویر لینے کا کوئی حقیقی تمدنی فائدہ ہو، یا جبکہ تصویر کسی بڑی تمدنی مصلحت کے لئے ناگزیر ہو تو صرف اس غرض کو پورا کرنے کی حد تک یہ فعل جائز ہوگا۔ مثلاً پاسپورٹ، پولیس کا مجرموں کی شناخت کے لئے تصویریں محفوظ کرنا، ڈاکٹروں کا علاج کے لئے یا فن طب کی تعلیم کے لئے مریضوں کی تصویریں لینا، اور جنگی اغراض کے لئے فوٹوگرافی کا استعمال۔ یہ اور دوسرے استعمالات حکم عام سے مستثنیٰ قرار پائیں گے، بشرطیکہ وہ غرض جس کے لئے اس استثناء سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہو۔ بجائے خود حلال ہو۔ لیکن لیڈروں کی تصویریں اور جلسوں اور جلوسوں کی تصویریں کسی طرح بھی جائز اور حقیقی ضرورت کی تعریف میں نہیں آتیں۔ خصوصاً لیڈروں کی تصویریں تو بندگان خدا کو اس خطرے سے بہت ہی قریب پہنچا دیتی ہیں جس کی وجہ سے تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ کانگرس کے اجلاس میں گاندھی جی کا بارہ فٹ لمبا فوٹو، یا پولینڈ پر روسی قبضہ کے بعد ہی اسٹالین کی تصویروں کا پولینڈ کے ایک ایک گاؤں میں درآمد کیا جانا، یہ روس میں ہر جگہ اسٹالین اور پولٹ بورو کے ارکان کی تصویروں کو لوگوں کے سروں پر مسلط رہنا، یہ جرمن سپاہیوں کا ہٹلر کی تصویر کو سینے سے لگائے پھرنا اور ہسپتال میں مرتے وقت اس کی تصویر کو آنکھوں سے لگا کر جان دینا، یہ سینما میں شاہ انگلستان کی تصویر سامنے آتے ہی لوگوں کا کھڑا ہو جانا، یہ سکوں پر بادشاہ کی تصویر کا بطور علامتِ حاکمیت ثبت کیا جانا، کیا یہ سب بت پرستی کی جڑیں نہیں ہیں؟ آخر اسی لئے تو اسلام نے تصویر کو حرام کیا ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر خدا کے سوا کسی دوسرے کی کبریائی کا نقش قائم نہ ہونے پائے۔ میں تو چھوٹے بچوں کی تصویریں لینے کو بھی اسی لئے حرام سمجھتا ہوں کہ معلوم نہیں ان بچوں آگے چل کر کس کو خدا بنا لیا جائے اور اس کی تصویر فتنہ کی موجب بن جائے۔ کنھیا جی کی بچپن کی تصویر آج تک بک رہی ہے۔ لہٰذا آپ اپنے دوست کو سمجھا دیجئے کہ ان کا پیشہ شریعت کے نقطۂ نظر سے جائز نہیں ہے۔ اگر وہ خدا کا خوف رکھتے ہیں تو بتدریج اس پیشہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا ذریعۂ معاش تلاش کر لیں۔ اور اگر یہی کام کرنا چاہتے ہیں تو اسے خواہ مخواہ حلال بنانے کی کوشش نہ کریں۔ اخلاقی تنزل کا بدترین مرتبہ یہ ہے کہ آدمی جس گناہ میں مبتلا ہو اسے جھوٹی تاویلوں سے صواب ٹھیرا لے۔ اس گڑھے میں گرنے کے بعد بھی آدمی کے سنبھلنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

[redacted]

اے ایمان والو!

خدا سے ڈرتے رہو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم نہ مرو مگر مسلمان ہو کر۔ اور اللہ کی رسی کو تم سب مل کر مضبوطی سے تھامے رہو اور پراگندہ نہ ہو جاؤ اور خدا کی نعمتوں کو یاد کرو جبکہ تم دشمن تھے پس تمہارے دلوں کو باہمی محبت سے بھر دیا تو تم بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے اس نے تم کو وہاں سے نکال دیا۔ اسی طرح وہ اپنی نشانیاں ظاہر کرتا ہے تاکہ تم ہدایت یاب ہو۔ اور تم میں ایک گروہ ضرور ہو جو نیکی کا حکم کرے اور بدیوں سے روکے اور نیکی کی طرف بلائے۔ یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں (آل عمران۔ ۱۱)

SCANNED BY
OFFICES OF
AMIN H. KARIM
MD

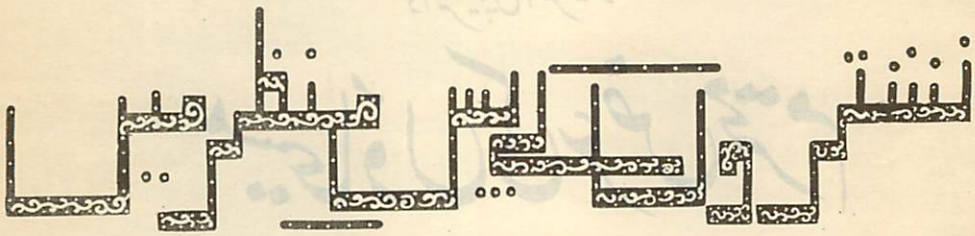

ڈاؤ میڈیکل کالج

سید سجاد جاوید۔

ہسٹریا یا آسیب

ڈاکٹر کیپٹن اختر راز

مسیحاؤں کی عرض محترم

عبدالقدوس

میں نرس ہوں بیسوا نہیں

۔ عنایت اللہ

تمباکو نوشی ۔ ایک بین الاقوامی المیہ

ڈاکٹر مظفر اقبال چغتائی

امان اللہ خاں

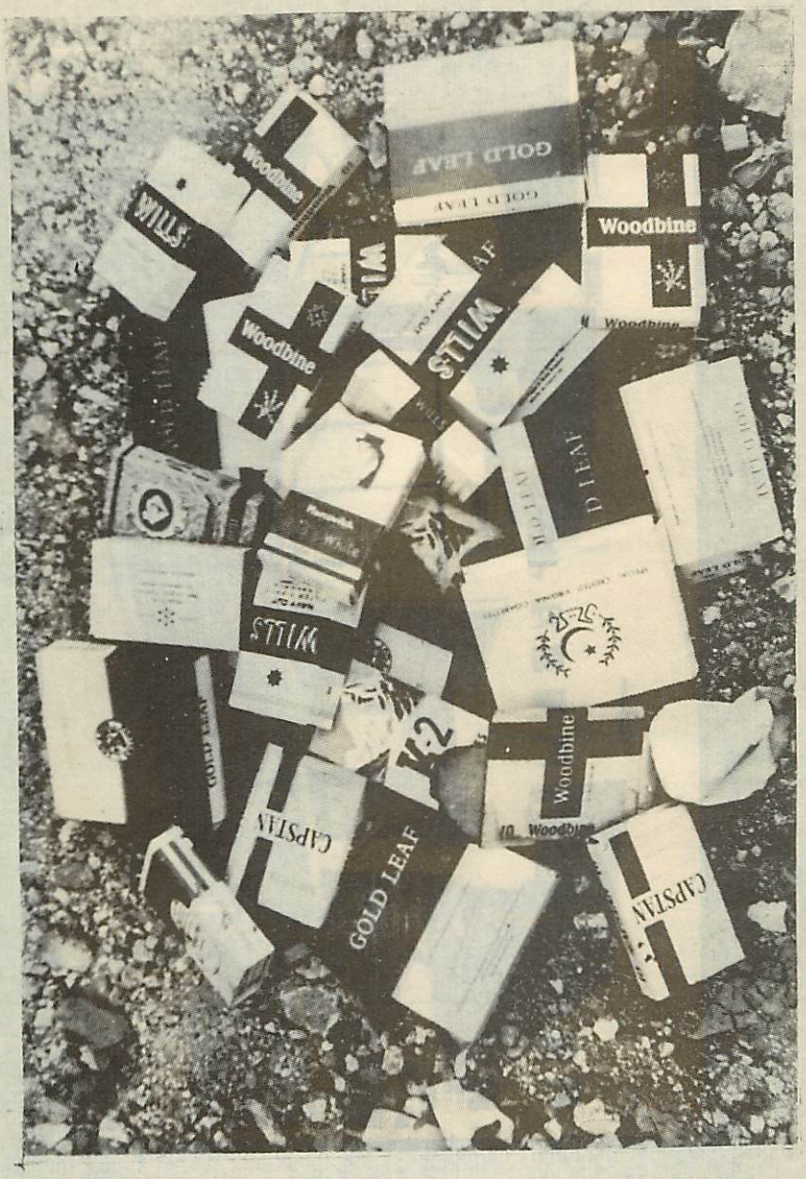

GOLD LEAF
Woodbine
WILLS
CAPSTAN
K2

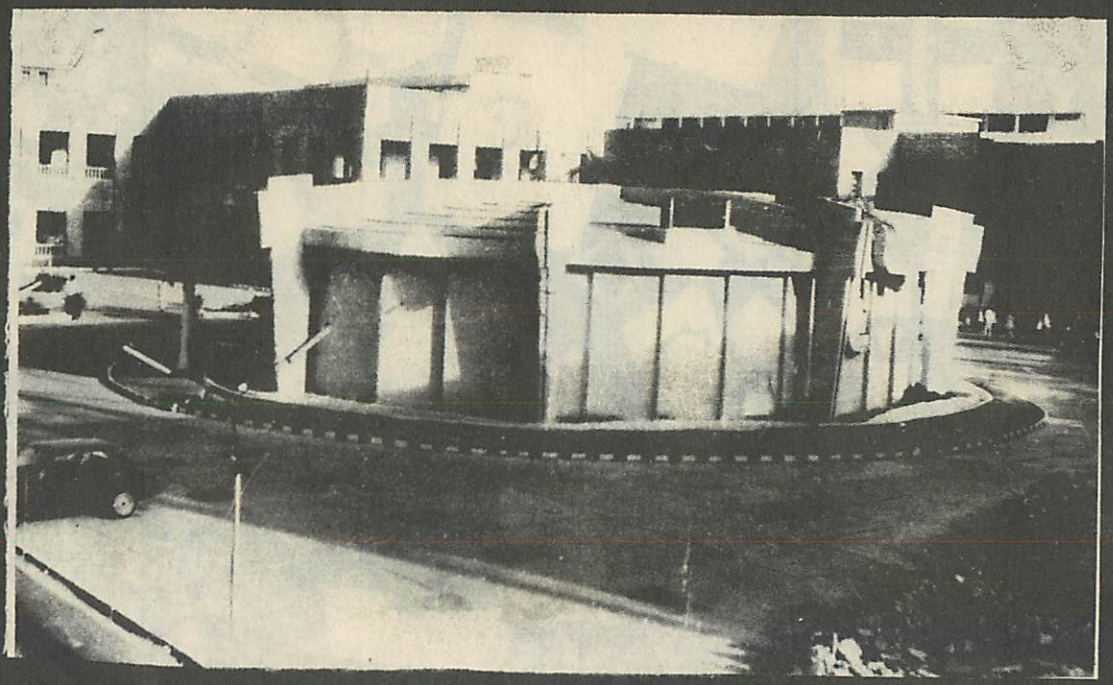

مسیحاؤں کی عرضِ محترم

جناب عبدالقدوس سال آخر کے طالبعلم اور کالج کے جانے پہچانے لکھنے والے ہیں

مندرجہ ذیل نظم مسیحاؤں کی ارضِ محترم انہوں نے سال آخر کو دیئے جانیوالے الوداعیہ میں پڑھی

میرے کالج، اے مسیحاؤں کی ارضِ محترم
وادیٔ اہلِ محبت، خطۂ اہلِ کرم
تیری آغوشِ محبت میں گزرے پانچ سال
یاد سے ان کی رہے گا روشن ایوانِ خیال
تھا تیرا دامانِ شفقت دامنِ مادر
تو نے ہی بخشا شعورِ زیست کا جوہر
ذہنِ ناآسودہ کو بخشا سکونِ آگہی
فکر کو تو نے عطا کی اک نئی تابندگی
کچھ نہ تھے ہم۔ تو نے دارائے مسیحائی کیا
دستِ محرومی کو اعجازِ مسیحائی دیا
تیرا لطفِ کرم عنوان ہماری زیست کا
ہے تیرا فیضان ہی سامان ہماری زیست کا
آج گو تجھ سے بچھڑ جانے کا غم جانکاہ ہے
ہاں مگر، ہر دل تیرے پیغام سے آگاہ ہے
شفیق ترا اساتذہ یاد آئیں گے ہر وقت ہمیں
اس کے خلوص کے صلے میں عہد کرنا ہے ہمیں
عام کردیں گے تیرے فیضان کو دنیا میں ہم
ہر قدم پر اپنے منصب کا رکھیں گے بھرم
وقف کردیں گے ہم اپنی زیست خدمت کے لئے
قیمتی دولت بنیں گے، ملک و ملت کے لئے
میرے کالج زندہ و درخشندہ و تابندہ باد
اے مسیحاؤں کی ارضِ محترم پائندہ باد

ڈاؤ میڈیکل کالج

سید ساجد جاوید احمد

ڈاؤ میڈیکل کالج کی بنیاد ۲۵ برس پہلے مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۴۵ء کو اس وقت کے گورنر سندھ سر ہگ ڈاؤ کے ہاتھوں رکھی گئی۔ ڈاکٹر ہوملمڈ کی ذاتی کاوشوں کے نتیجے میں ۱۸۸۱ء میں حیدرآباد (سندھ) میں ایک میڈیکل اسکول قائم کیا گیا۔ ۱۹۴۱ء میں جب انڈین میڈیکل کونسل نے پورے ہندوپاک میں ایک ہی طرز کا نظام تعلیم رائج کرنے کا فیصلہ کیا تو اس میڈیکل اسکول کو میڈیکل کالج بنانے کی تجویز بھی پیش کی گئی اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی تشکیل کی گئی۔ جس نے جلد ہی اپنی رپورٹ حکومت سندھ کو پیش کر دی۔ مالی مشکلات آڑے آئیں اور اس تجویز کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۳ء میں اس وقت کے وزیر صحت و دفاع عامہ ڈاکٹر ہمنداس۔ آر۔ وڈھوانی نے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ جون ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد میڈیکل اسکول۔ حیدرآباد میڈیکل کالج بنا۔ اس سال کل ۴۵ طلبہ کو داخلہ دیا گیا۔ ڈاکٹر کیول رام تارا سنگھ رامچندانی کو کالج کا پہلا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۴۵ء ہی میں کالج کو کراچی منتقل کر دیا گیا۔

آج جو عمارتیں لائبریری، کالج آفس اور کامن روم کے طور پر استعمال ہو رہی ہیں۔ کبھی کالج کی عمارت کا فرض انجام دے رہی تھیں۔ مسٹر پی۔ ڈبلیو۔ ایچ چندانی۔ ایگزیکٹو انجینئر سندھ اور لیفٹیننٹ کرنل جے ای۔ گرے نے کالج کی عمارت کا نمونہ تیار کیا۔ دسمبر ۱۹۴۶ء میں نئی عمارت کی پہلی منزل کو بروئے کار لایا جانے لگا۔ یہاں پر وفیسر شاہ صاحب اور ان کی اہلیہ کی ان تھک کوششوں کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں جن کی وجہ سے ایک سال ہی میں اناٹومی میوزیم کی تشکیل ہو گئی دو سال کے اس مختصر عرصہ تک کالج بمبئی یونیورسٹی سے منسلک رہا۔

قیام پاکستان کے بعد ۲۲-۲۳ دسمبر ۱۹۴۷ء کو سندھ یونیورسٹی کی متعین شدہ کمیٹی نے کالج کا معائنہ کیا اور تیسرے ایم بی بی ایس کے ڈگری امتحان کی منظوری دے دی (جو آج کل کے آخری سال کے امتحان کے برابر ہے)۔

کالج ۱۹۵۱ء سے کراچی یونیورسٹی سے منسلک ہے، جولائی ۱۹۵۱ء تک کالج حکومتِ سندھ کے اختیار میں رہا۔ پھر ۸ جولائی

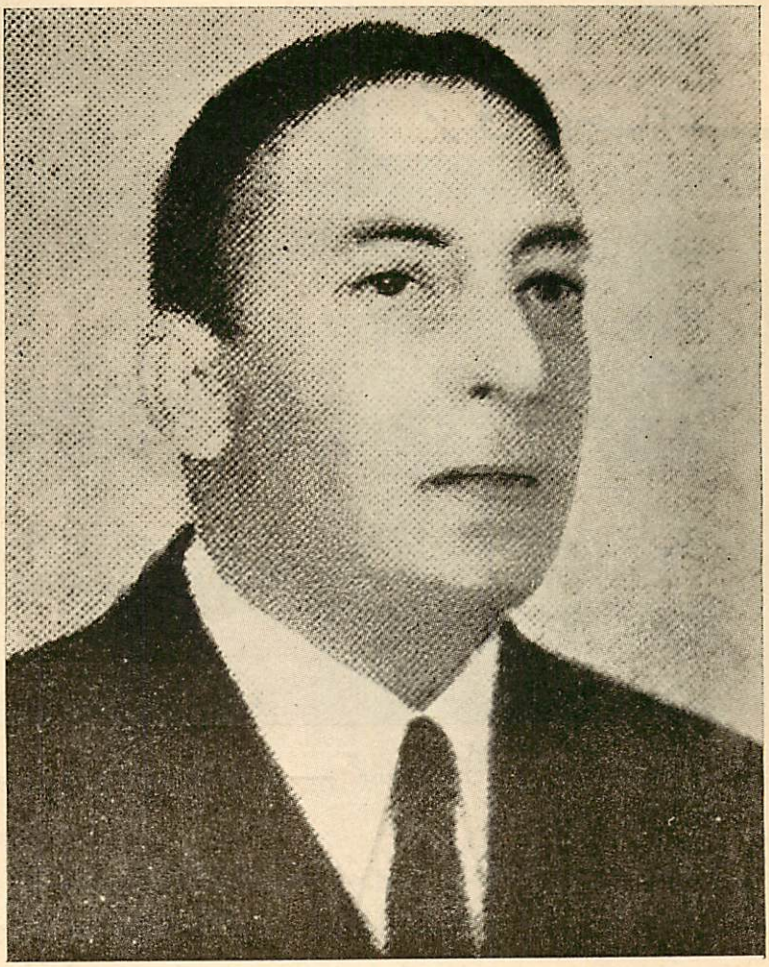

SIR HUGH DOW
Founder of
Dow Medical College Karachi

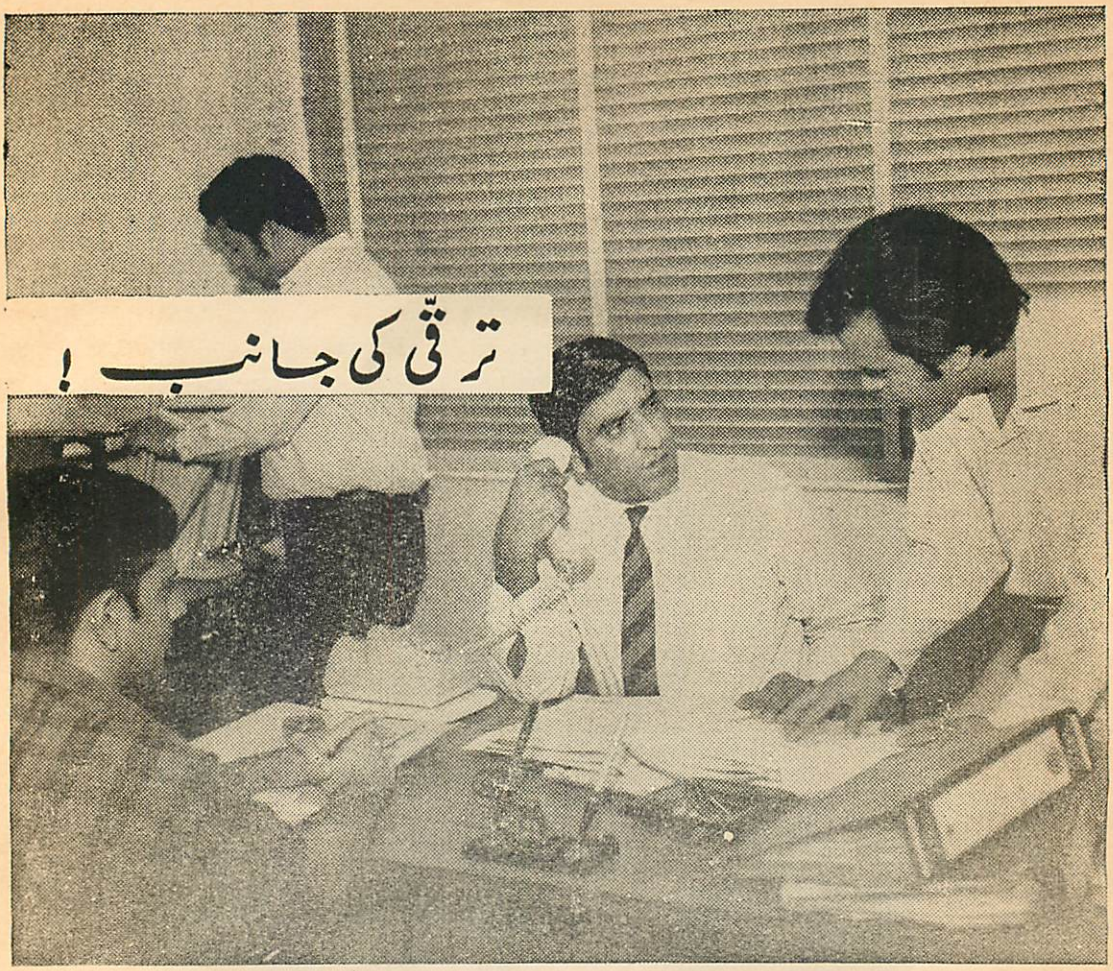

لین دین، خرید و فروخت، دکانداری —— تجارت چھوٹی ہو یا بڑی، قومی معیشت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

یو بی ایل تاجروں اور دکانداروں کے لئے بینکاری کی جدید ترین خدمات پیش کرتا ہے۔

ملک بھر میں ۶۰۰ سے زائد شاخیں - بیرونی شاخیں لندن، ایسٹ لندن، برمنگھم، شیفیلڈ، بریڈفورڈ، مانچسٹر، بحرین (باب البحرین روڈ)، بحرین (منامہ)، العین، ابوظبی، دوبئی، شارجہ، ڈیرہ دوبئی، اجمان، ام القوین، راس الخیمہ اور دمام۔ پاکستان میں ذیلی ادارہ یونین بینک لمیٹڈ یونائیٹڈ بینک۔ اے۔ جی۔ زیورچ اور یونائیٹڈ بینک لبنان اینڈ پاکستان ایس۔ اے۔ ایل۔

یو بی ایل کے لئے سبھی گرم فرما اہم ہیں۔

یو بی ایل

راہِ ترقّی میں پیش پیش
ایک بین الاقوامی بینک

UBL.1 3 193.71.UD.R. LINTAS

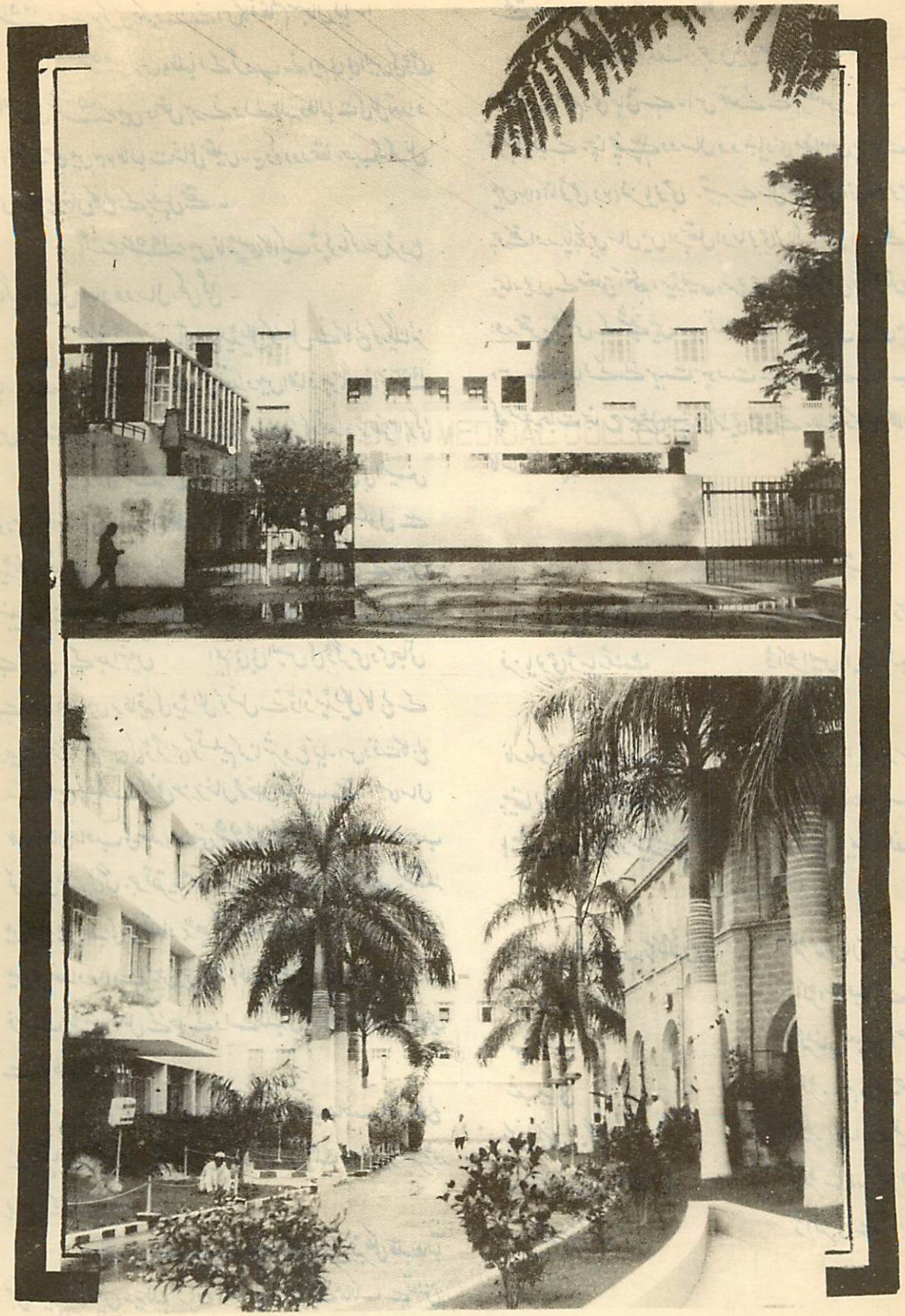

۱۹۵۱ء سے مرکزی حکومت نے اس کا انتظام سنبھال لیا ۔

۱۹۵۱ء میں ۹ طلباء کے گروپ نے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی ۱۹۵۰-۱۹۵۱ء میں داخل ہونے والے طلبہ وطالبات کی کل تعداد ۱۰۷ تھی ۔ جن میں ۴۲ طالبات شامل تھیں ۔ یہ وہ دور تھا جب کہ کرنل خاں محمد عزیز خاں کالج کے پرنسپل تھے ۔

اگست ۱۹۵۲ء میں فارمیسی کا ایک ڈپلوما کورس شروع کیا گیا ۔ جس کی معیاد دو سال رکھی گئی ۔

۱۹۵۳ء میں پاکستان میڈیکل کونسل نے کالج کو ریکگنائز کیا ۔ وقت کے ساتھ ساتھ طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا چنانچہ ۱۹۵۳ء میں فرسٹ ایئر میں داخل کئے جانے والے طلبہ کی تعداد بڑھ کر ۱۳۰ ہوگئی

جولائی ۱۹۵۴ء میں ایک خصوصی ایم بی بی ایس کورس کی ابتدا کی گئی ۔ یہ ان طلبہ کے لئے تھا ۔ جو میڈیکل اسکول سے میڈیکل لائیسنیئس کا کورس کر چکے تھے ۔ اس نئے کورس کے مطابق انہیں کم از کم دو سال ہسپتال میں مختلف مضامین کی تربیت لینی پڑتی ہے ۔ جس کے بعد انہیں ایم بی بی ایس کی ڈگری دی جاتی ہے ، ۱۹۵۵ء میں برطانیہ کی میڈیکل کونسل نے ڈاؤ میڈیکل کالج کے تربیت یافتہ گریجوئیٹس کی ڈگری کو تسلیم کرنا شروع کیا ۔ اس وقت کالج کے پرنسپل لیفٹیننٹ کرنل عزیز خاں محمد خاں صاحب تھے ۔ اسی سال عزیز خاں صاحب کی جگہ ۲۶ ۔ مئی ۱۹۵۵ء کو پروفیسر محمد علی شاہ صاحب کو پرنسپل مقرر کیا گیا ۔ جو تقریباً ۱۴ سال اس عہدہ پر فائز رہے ۔ ۱۹۵۷ء میں کالج میں طلبہ کی کل تعداد بڑھ کر ۸۶۵ ہوگئی ۔ اس سال یعنی ۱۹۷۱ء میں کل تعداد ۱۱۰۰ ہے ۔ جن میں ۲۸۵ طالبات بھی شامل ہیں ۔ جب کہ فرسٹ ایئر میں داخل کئے جانے والے طلبہ کی تعداد ۲۲۳ ہے ۔ جن میں سے ۱۰۰ طالبات ہیں ۔

۳۰ ستمبر ۱۹۶۹ء کو پروفیسر عبدالوحید صاحب کا تقرر کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے عمل میں لایا گیا اور اب تک وہ ہی ایڈمنسٹریٹر اور پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہیں ۔

ملکی طلبہ و طالبات کے علاوہ کالج میں غیر ملکی طلبہ وطالبات بھی تعلیم پاتے ہیں ۔ یہ طلباء زیادہ تر مشرقی وسطیٰ کے ممالک سے تعلق رکھتے ہیں ۶۸-۶۹ ۱۹ء تک ان کی کل تعداد ۱۱۷ تھی ۔

کالج کے مختلف درجوں میں علم طب سے متعلق مختلف مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ اس مقصد کے لئے ہر مضمون کا ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے ۔ چنانچہ پہلے دو سال دو بنیادی مضامین پڑھائے جاتے ہیں (۱) اناٹومی (۲) فزیالوجی ۔ تیسرے سال پیتھالوجی ، فارماکولوجی اور چوتھے اور پانچویں سال میں اوپتھلمولوجی ، ناک کان اور گلے کی بیماریوں کے متعلق آنکھ ، میڈیسن ، سرجری ، اوبسٹیٹرکس اور گائینکولوجی اور آرتھوپیڈکس کے شعبے ہیں ۔ یہ تمام شعبے سول ہسپتال ہی میں ہیں جس سے طلبائ کے لئے بہت سہولت ہے اس سے پہلے جب کہ کچھ شعبہ جات جناح سینٹرل ہسپتال کراچی میں تھے ۔ طلباء کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا ۔

	سربراہ شعبہ
اناٹومی ڈیپارٹمنٹ	پروفیسر اے ۔ وحید
فزیالوجی ڈیپارٹمنٹ	ڈاکٹر ایس ۔ ایچ ۔ زیدی
فارمکولوجی ڈیپارٹمنٹ	ڈاکٹر ایس ایم ۔ یوسف
پیتھالوجی ڈیپارٹمنٹ	ڈاکٹر تفضل حسین
ہائیجین اور پریونٹیو میڈیسن	ڈاکٹر ایم ۔ انصاری
فورینسک میڈیسن اور ٹوکسکولوجی	ڈاکٹر محمد عمر خاں ۔ پولیس سرجن
سرجری	ڈاکٹر اسماعیل اے اگجی
میڈیسن	ڈاکٹر خان معین احمد
شعبہ بینائی	ڈاکٹر ۔ ایم ۔ ایم حسن
ناک ، کان ، گلہ	ڈاکٹر ۔ ایم ۔ اے قیوم
اوبسٹیٹرکس اور گائینکولوجی	ڈاکٹر سالار اختر عزیز
اور تھوپیڈکس	ڈاکٹر اے ۔ رحیم

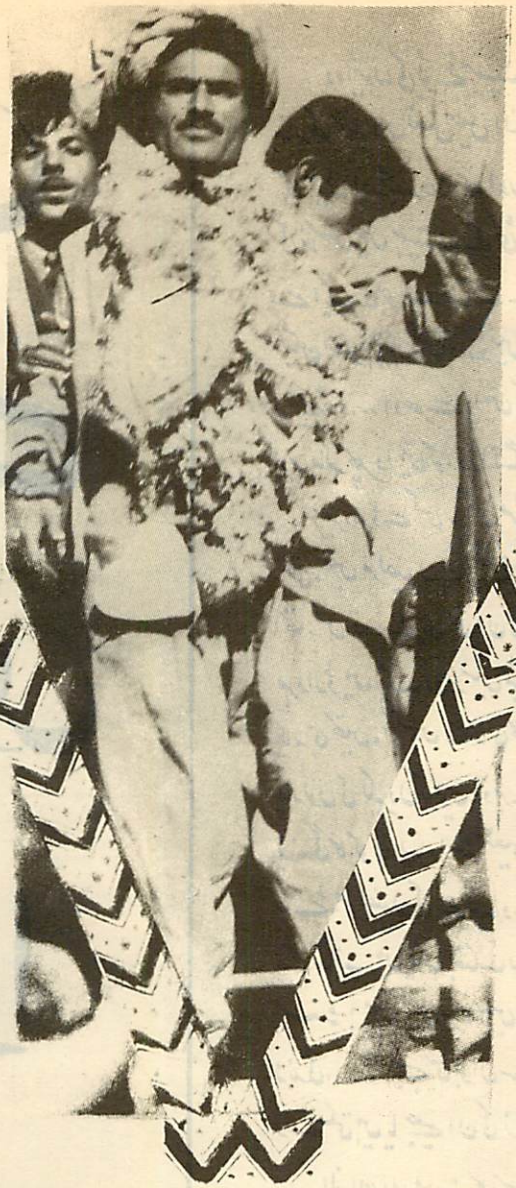

جناب عبدالحئی بلوچ

[illegible] دسمبر ۱۹۷۰ء کو قومی اسمبلی کا الیکشن [illegible]

میں نرس ہوں بیسوا نہیں

عنایت اللہ

دوائیوں کی بُو نے ہسپتال کی فضا کو متعفن ہی نہیں ڈراؤنا بنا رکھا تھا۔ اس تعفن میں انسانی خون کی بو بھی تھی۔ سارا ماحول ہی علیل اور مجروح تھا اور دھیمے دھیمے کراہ رہا تھا۔ مجھے ایک نرس کی تلاش میں ہسپتال کے کئی وارڈوں میں گھومنا پڑا۔ ہر وارڈ سے ایک ہی جواب ملتا تھا ——— "ہاں، وہ ڈیوٹی پر تو ہے لیکن معلوم نہیں کس وارڈ میں ہو گی...... فلاں نمبر وارڈ میں دیکھئے..... ادھر سے دائیں گھوم جائیے۔ ساتھ ہی سیڑھیاں ہیں' اوپر جاکر پھر دائیں کو، ذرا آگے سیدھے جاکر......"

ہر وارڈ سے کسی نہ کسی مریض کی دکھیاری ہائے، مجھے چونکا دیتی تھی۔ میں مریضوں پر اچکتی ہوئی نگاہ ڈالتا وارڈ وارڈ گھوم رہا تھا۔ کس قدر بے بسی تھی ان زرد پیلے چہروں اور بے نور آنکھوں میں ہر وارڈ میں ایک دو نرسیں ٹمپریچر لے رہی تھیں، انھیں دوائیاں پلا رہی تھیں، انجکشن لگا رہی تھیں، چارٹ دیکھ رہی تھیں۔ اور چارٹوں کی لکیروں کو یوں اوپر نیچے کر رہی تھیں جیسے مریضوں کی زندگی کا کوئی ایسا راستہ متعین کر رہی ہوں جسے موت نہ کاٹ جائے۔ مریضوں کی بے نور اور ہاری ہاری سی آنکھیں ان نرسوں کے تعاقب میں یوں بھٹک رہی تھیں جیسے التجا کر رہی ہوں ——— "سسٹر! میں ابھی مرنا نہیں چاہتا...... مجھے بچالو...... زندگی.. زندگی...." جیسے یہی جوان سال لڑکیاں انہیں موت سے پناہ دے سکتی ہیں یا جیسے ان کی زندگی ان ہی لڑکیوں کے ہاتھوں میں ہو۔

انسان اور موت کا رشتہ کس قدر قریبی ہے۔ [illegible] تلخیوں اور زندگی کے رنج و آلام سے گھبرا کر انسان مر جانے کی دعائیں کرتا ہے۔ شکست خوردہ زندگی کی آخری پناہ گاہ موت ہی ہوتی ہے ——— "یا خدا! اس جینے سے تو موت ہی دیدے" لیکن موت کے غیر مرئی پروں کی پراسرار سرسراہٹ سن کر انسان ڈر جاتا ہے اور بچ نکلنے کے لئے تنکوں کے سہارے ڈھونڈنے لگتا ہے۔ میں نے تین جگہوں پر انسان کو موت کے پروں کے سائے تلے بیٹھے اور تھر تھر کانپتے دیکھا ہے ——— جیل میں پھانسی

پانے والے قیدیوں کو پھانسی کی کوٹھڑیوں میں، محاذ پر وطن کی آن پر لڑتے مرنے والے سپاہیوں کو اور ہسپتالوں میں مریضوں کو ـــــ پھانسی پانے والوں کو کوئی نہیں بچا سکتا، محاذوں کے جیالے وطن کی خاطر مر جانے سے نہیں ڈرتے لیکن ہسپتال کے وارڈوں میں جینے کی آس لگی رہتی ہے۔ خدا اور ڈاکٹر کے بعد یہ آس نرس کی شگفتہ مسکراہٹوں کے سہارے قائم رہتی ہے۔ بعض مریض مر بھی جاتے ہیں لیکن نرس جاں بلب مریض کی پیشانی کو سہلاتے "تم اچھے ہو جاؤ گے" کہہ کہہ کر اسے موت کی تلخی سے بچائے رکھتی ہے۔ ہر مریض کی خواہش ہوتی ہے کہ نرس اسی کی نبض پر ہاتھ رکھے رہے اور یقین دلاتی رہے کہ تم اچھے ہو جاؤ گے۔ ہسپتال میں نرس کا وجود خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر آپریشن یا تشخیص کر کے علاج تجویز کر دیتا ہے، اور دن میں ایک آدھ بار وارڈ میں آ کر مریضوں کو دیکھ جاتا ہے صرف نرس ہے جو ڈاکٹر اور مریض کے درمیان ایک کڑی بنی رہتی ہے۔ اگر یہ کڑی ٹوٹ جائے یا کمزور ہو جائے تو زندگی کی ساری ہی کڑیاں ٹوٹنے لگتی ہیں۔

اس سے پہلے میں نے نرس کو صرف عورت کے روپ میں دیکھا تھا۔ اس روز جب نرس میرے مضمون کا موضوع بنی تو میں نے ان جوان سال لڑکیوں کو بڑے غور سے دیکھا تو ان کے روپ میں مجھے چار روپ نظر آئے ـــــ مسیحا، ماں، بہن اور بیٹی ـــــ مگر انٹرویو کے دوران جب ایک نرس نے احتجاج سے بھرپور مسکراہٹ سے کہا ـــــ "مردوں کو ایک بات سمجھانے کی کوشش کیجئے کہ میں نرس ہوں، بیسوا نہیں" ـــــ تو مجھے یوں دھچکا لگا جیسے اس نے میرے منہ پر تھوک دیا ہو۔

وہ مجھے زنانہ وارڈ میں ملی اور کہنے لگی ـــــ مجھے معلوم تھا کہ آپ آئیں گے۔ اس وقت تو میں ڈیوٹی پر ہوں۔ آپ شام کو مل سکیں گے۔؟" ـــــ اور جب وہ مجھے شام کے وقت ملی تو یکسر بدلی ہوئی تھی۔ سر پر سفید رومال کی جگہ سفید دوپٹہ تھا جس نے اس کے سر، گدھوں اور سینے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ایپرن کی جگہ کاٹن کی پھولدار قمیض تھی۔ اب اس کے کپڑوں سے دوائیوں کی بو بھی نہیں آ رہی تھی۔

"اگر آپ کو نرسنگ کے پیشے کے متعلق لکھنا ہے تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو لوگوں کے لئے نئی ہو" اس جواں سال، بھرے بھرے جسم اور تھکے تھکے معصوم سے چہرے والی نرس نے کہا ـــــ "وہ تو میں آپ کو دو جملوں میں بتا سکتی ہوں کہ نرس مریضوں کی دیکھ بھال کرتی ہے، ٹمپریچر لیتی ہے اور وقت پر دوائی دیتی ہے۔ ان دو جملوں کو پھیلا کر نرس پر ایک جوابِ مضمون لکھ لیجیے ..... دراصل جو کچھ میں کہنا چاہتی ہوں وہ ہر نرس کی آواز بلکہ فریاد ہے مگر آپ وہ لکھیں گے نہیں کیونکہ آپ بھی مرد ہیں۔"

میں نے جب اس سے وعدہ کیا کہ وہ جو کچھ کہے گی میں وہی کچھ لکھوں گا کیونکہ میرے پیشِ نظر نرس کا انٹرویو ہے۔ مرد کی وکالت نہیں تو اس نے مجھ سے پوچھا ـــــ "کیا آپ کو کبھی ہسپتال میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جہاں نرس نے آپ کی تیمارداری کی ہو؟"

"جی نہیں! ایسا خوشگوار اتفاق تو کبھی نہیں ہوا" میں نے کہا۔ "صرف ایک بار فوج میں زخمی ہو کر میں ہسپتال میں چند دن رہا تھا لیکن میری تیمارداری بڑی بڑی مونچھوں والے ایک نرسنگ سپاہی نے کی تھی۔ میں چند دن ہی وہاں رہا تھا اور ڈاکٹر سے چھٹی لے کر جلدی بھاگ آیا تھا۔"

"کیونکہ آپ کی تیمارداری بڑی بڑی مونچھوں والے نے کی تھی" اس نے شرارت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔ "اگر وہاں نرسیں ہوتیں تو آپ کا زخم اتنی جلدی ٹھیک نہ ہوتا... میں بے تکلفی کی معافی چاہتی ہوں۔"

میں نے اسے پھر یقین دلایا کہ میں بے تکلفی میں سب کچھ سننا چاہتا ہوں اور بے تکلفی سے ہی لکھوں گا۔ تو اس نے کہا ـــــ "لیکن میں اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتی...." اس کے چہرے کا تاثر بدلنے لگا۔ چپ سی ہو گئی پھر کہنے لگی۔

میری باتیں کچھ ایسی ہیں جو آپ نے من وعن لکھ دیں اور ساتھ میرا نام دے دیا تو ایک نہیں بیسیوں سکینڈل میری ذات سے وابستہ کر دئیے جائیں گے۔ اور جتنے مردوں کو میں آج تک راستے کا روڑا سمجھ کر ٹھکرا چکی ہوں، وہ نہ جانے عشق و محبت کے کیسے کیسے ننگے افسانے میرے نام پر گھڑیں گے میں مرد کی فطرت سے خوب آگاہ ہوں۔ کوئی نہ کوئی کہہ اٹھے گا —— ارے یہ نرس ؟ بڑی پاک دامن بنی پھرتی ہے ؟ یہ تو کوئی بیس مرتبہ میرے ساتھ پکچر دیکھنے گئی ہے۔ یہ وہ ہوگا جس نے میری (یعنی ایک نرس) مسکراہٹ کو غلط سمجھ کر پکچر کی دعوت دی ہوگی۔ اور میں نے ٹھکرا دی ہوگی عاشقوں کے اسی ہجوم میں ایک اور آدمی چیخ اٹھے گا

ارے یہ لڑکی ؟ . . . . یہ تو کراچی کے ایک ہوٹل میں میرے ساتھ چار روز رہی ہے —— یہ وہ حضرت ہوں گے جنھوں نے مجھے چھٹی لے کر کراچی چلنے کی دعوت دی ہوگی۔ پھر وہ جواں سال امیرزادہ بھی ہوگا۔ جس نے مجھے رات کے وقت ہسپتال سے آتے کار میں لفٹ پیش کی تھی۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور لفٹ قبول نہ کی۔ میں ابھی ابھی ڈیوٹی سے آئی تھی اور بدقسمتی سے میرے ہونٹوں پر ہسپتال والی مسکراہٹ تھی جو قوم کے اس سپوت کو دھوکا دے گئی۔ اس نے میری کلائی تھام کر بے ہودہ سی بات کہہ دی اور ایسی بے ہودہ حرکت کر بیٹھا کہ میرا ردعمل میرے قابو میں نہ رہا۔ میں اس وقت چونکی جب میرا بھرپور ہاتھ اس کے جواں سال گال پر پڑ چکا تھا۔ وہ بوکھلا گیا۔ میں گھبرا گئی اور اسے گال سہلاتا چھوڑ کر وہاں سے بھاگ آئی۔ گھر آ کر جب طبیعت ٹھکانے آئی تو مجھے یاد آیا کہ ایک بار اس کی بہن آٹھ دس روز ہسپتال میں الگ کمرے میں رہی تھی اور یہ نوجوان اسے دیکھنے آیا کرتا تھا۔ اس کی بہن کو تو نرس کی اتنی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کی بیماری کوئی ایسی پیچیدہ نہیں تھی کہ ہر لمحہ دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی وہ تو اس لئے ہسپتال کے الگ کمرے میں آئی تھی کہ ان کے پاس فالتو دولت تھی۔ جب اس کا یہ بھائی اسے دیکھنے آتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کمرے میں نرس کی شدید ضرورت ہے اسے اپنی بہن سے زیادہ میرے ساتھ ہمدردی تھی۔ آٹھ دس دنوں میں اس نے مجھ سے کوئی چھ بار پوچھا کہ تنخواہ کتنی لیتی ہو؟ اور ہر بار میرا جواب سن کر سراپا ہمدردی بن گیا اور یہ فقرہ دہرایا —— اس قدر سخت اور غلیظ ڈیوٹی اور اس قدر قلیل تنخواہ ؟ . . . .! کوئی دو دفعہ اس نے کہا تھا —— اس مکروہ ماحول سے نکل کر ذرا "آؤٹنگ" کے لئے ضرور جایا کرو، تم تو پندرہ برس کی معصوم سی لڑکی لگتی ہو لیکن چہرہ مرجھا کر تیس چالیس برس کا نظر آتا ہے۔ کسی روز چلو تمہیں مری گھما لاؤں، اپنی گاڑی ہے، . . . . جب یہ نوابزادہ میرا نام پڑھے گا تو وہ ہر کسی کو کہتا پھرے گا کہ دیکھو کم بخت مومن بنی پھرتی ہے دس بار میرے ساتھ مری ہو آئی ہے۔ ہر وقت پیچھے پڑی رہتی تھی کہ میرے ساتھ شادی کر لو . . . . "

اس نے ہنس کر کہا۔ "وہ میرے تھپڑ کا انتقام ضرور لے گا۔ مرد کے پاس عورت کو شکست دینے کے لئے آخری حربہ یہی ہوتا ہے کہ اسے بدنام کر دے۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ عورت ہے۔ کسی مظلوم بیوی کے جائز گلے شکووں سے تنگ آ کر خاوند اتنی سی بات کہہ دے کہ میں تمہارے لچھن خوب جانتا ہوں تو بیوی تمام بیوی تمام انگارے اپنے سینے میں دبا کر چپ ہو رہتی ہے۔ اسی طرح یہ آدمی اور اس جیسے کئی ایک آدمی میرے خلاف یہی حربے استعمال کریں گے۔ میدان میں پٹا ہوا شخص تصور میں فاتح بن کر دل خوش کر لیا کرتا ہے جس طرح بھارتی حکمراں چھمب، جوڑیاں اور کھیم کرن ہار کر اعلان یہ کرتے رہے تھے کہ لاہور پر بھارتی فوج قابض ہے —— وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی اور مایوس سے لہجے میں پوچھنے لگی —— آپ میرا فوٹو تو نہیں مانگیں گے ؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے دوٹوک کہا۔

اس نے اطمینان کی سانس لی اور بولی —— "ایک بار

ایک اخبار کا رپورٹر میرا انٹرویو لینے آیا تھا میں نے اسے بھی یہی باتیں سنائی تھیں جو میں آپ کو سنا رہی ہوں مگر میرا انٹرویو اس اخبار میں آج تک نہیں آیا۔ ایک سال گزر گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس رپورٹر نے مجھ سے میرا فوٹو مانگا تھا اور میں نے انکار کر دیا تھا۔ اس کا فوٹو مانگنے کا انداز یہ تھا کہ ـــــ اپنا کوئی سویٹ پوز دیں، اس نے میرے بالوں کو چھو کر کہا ـــــ یہاں سے دو چار بال دوپٹے سے باہر ہوں تو..... تو کے آگے اس کی زبان بند ہو گئی لیکن اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی آوارہ سی چمک نے اس کے دل کی بات کہہ دی۔"

"پھر آپ نے اسے کچھ کہا؟"

"کچھ بھی نہیں..... وہ شگفتہ سی ہنسی ہنس دی اور کہنے لگی۔ "خدا گواہ ہے، میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ غلطی میری تھی کہ میں اسے باوقار صحافی سمجھ کر اس کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرنے لگی تھی۔ بہرحال میں نے تصویر نہ دی اور یہ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ایک سال ہو گیا ہے میرا انٹرویو اخبار میں نہیں آیا..... میں وہی باتیں آپ سے کروں گی پھر آپ خود فیصلہ کیجئے گا کہ قابل توجہ میری یہ باتیں ہیں یا میری تصویر! یعنی سویٹ پوز! ـــــ میں نے اس ایک سال کے عرصہ میں اس اخبار میں کئی عورتوں کے انٹرویو دیکھے ہیں جن کے ساتھ سویٹ پوز والی تصویریں بھی تھیں۔ اب تو ہر اخبار میں عورتوں کا صفحہ ہوتا ہے جس میں تحریر کم اور تصویریں زیادہ ہوتی ہیں بعض اوقات تو مجھے فلمی اشتہاروں والے صفحے اور عورتوں کے صفحے میں اس کے سوا کوئی اور فرق نظر نہیں آتا کہ وہ اشتہار ہوتے ہیں اور یہ مضمون۔ جہاں تک تصویروں کا تعلق ہے وہ دونوں صفحوں میں ایک جیسی ہوتی ہیں ـــــ اگر آپ کو بھی اپنا صفحہ سجانے کے لئے میری تصویر چاہئے تو اس انٹرویو کو یہیں لپیٹ دیجئے۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اخباروں اور رسالوں والوں کو اچانک عورت کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں پیدا ہو گئی ہے۔ جس صفحے کو دیکھو اس پر عورتوں کی تصویریں نظر آتی ہیں؟ اب تو ایسے رسالے بھی نکل آئے ہیں جو پورے پورے صفحہ پر ایک لڑکی کی رنگین تصویر چھاپنے لگے ہیں۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہونے لگا ہے؟ چند دن ہوئے میں ایسے ہی ایک زنانہ پرچے کے سرورق پر ایک لڑکی کی رنگین تصویر دیکھی ہے۔ بال کٹے ہوئے ماتھے پر بکھرے ہوئے، ہونٹ لال، گال سرخ، لباس ایسا کہ جسم آدھا ننگا اور تصویر کے ساتھ یہ عنوان ایک پاکستانی لڑکی ـــــ اس نے پوچھا ـــــ "کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستانی لڑکیوں کو اس طرح کا دلکش، رنگین اور نیم عریاں ہونا چاہئے یا اس طرح کا بے حیا نہیں ہونا چاہئے۔ کیا ایک مسلمان لڑکی کا روپ یہ ہے جو ان اخباروں اور رسالوں کی زینت بنایا جاتا ہے؟ اسلام کی وہ بیٹی کہاں گئی جس نے محاذ پر رسولِ اکرم صلعم کے زخموں کی پٹی کی تھی؟ قوم کی ان بیٹیوں کی کہانیاں تاریخ کے کس اندھیرے گوشے میں چھپ گئی ہیں جو زخمی مجاہدین اسلام کو دشمنوں کی صفوں میں جا کر تیروں اور برچھیوں کی بارش میں سرپٹ بھاگتے گھوڑوں کے طوفانوں سے اٹھا لاتی تھیں؟ دور نہ جائیے، سن سنتالیس کی مظلوم لڑکی کہاں گئی؟ اس کل کے دور کی مجاہدہ کہاں کھو گئی؟

اس کا چہرہ لال انگارہ ہوتا چلا گیا۔ اس نے تلخ سا گھونٹ نگل کر کہا۔ کس قدر شرمناک ہے یہ حقیقت کہ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ لڑکی کون تھی جس نے انگریز پولیس کی فائرنگ اور لاٹھی چارج میں لاہور سکریٹریٹ پر پاکستان کا جھنڈا لہرا دیا تھا؟ یہ تو کل کی بات تھی؟..... کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ لڑکی کون تھی جو ستمبر ۶۵ کی جنگ کے دوران اپنے بھائی کی تلاش میں لاہور کے ہسپتالوں میں بھٹک رہی تھی اس کا بھائی رضا کاروں کے ساتھ محاذ پر چلا گیا تھا۔ اتفاق سے وہ میرے والے ہسپتال میں آئی تو میں نے اس کا اتا پتا معلوم

کر لیا۔ وہ نوجوان شدید زخمی حالت میں لایا گیا تھا۔ میں نے اس بہن کو اس کی شہادت کی اطلاع دی تو بہن نے نہایت اطمینان سے کہا "اللہ اسے جنت نصیب کرے۔ ہماری پریشانی دور ہو گئی ہے۔ اس کے ایک ساتھی سے صرف اتنا پتہ چلا تھا کہ وہ زخمی ہو گیا تھا" ——— اس بہن کی آنکھوں میں میں نے آنسو نہ دیکھے۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ لاہور کی توپیں دھاڑ رہی تھیں۔ لاہور ہل رہا تھا اور یہ دھماکے اس بہن کو روحانی اطمینان دے رہے تھے ——— کیا آپ کو معلوم ہے وہ لڑکی کون تھی؟..... نہیں! کسی کو معلوم نہیں۔ مجھ سے پوچھو۔ وہ نیم عریاں، سویٹ پوز دینے والی لڑکی نہیں تھی۔ اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی لالی نہیں تھی وہ ایک عام پاکستانی لڑکی تھی، سچی پاکستانی لڑکی..... کیا آپ مجھے ان سوالوں کا جواب دے سکتے ہیں؟"

"بالکل نہیں!" میں نے کہا "شاید وہی رپورٹر جواب دے سکے جو آپ کے انٹرویو کے ساتھ آپ کی تصویر بھی مانگ رہا تھا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ عورتوں کی تصویروں والے رسالوں اور اخباروں کے خریدار مرد زیادہ اور عورتیں کم ہوتی ہیں!"

"اگر آپ کو تہہ دل سے میری باتوں سے دلچسپی ہے....." اس نے کہا "تو میرے انٹرویو کا عنوان یہ رکھئے۔ نرس کیا ہے، مرد اسے کیا بنانا چاہتا ہے؟..... یا یہ بہتر رہے گا "نرس مسیحا ہے بیوا نہیں" ——— ذرا تصور فرمائیے کہ ایک آدمی کو شدید زخمی حالت میں چند راہگیر سڑک سے اٹھا کر ہسپتال میں چھوڑ جاتے ہیں اس کے سکوٹر کی ٹکر کسی ٹرک سے ہو گئی ہے۔ ہڈیاں جانے کہاں کہاں سے ٹوٹ گئی ہیں جسم کا سارا خون سڑک پر بہہ گیا ہے اور صرف سانسیں چل رہی ہیں۔ موت بازی جیت رہی ہے۔ ہم اسے تازہ خون دیتے ہیں، ہڈیاں جوڑ اور زخم سی کر اسے الگ کمرے میں لٹا دیتے ہیں جب ہوش میں آکر اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ تو وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ہر کسی کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ وہ ماں کو ڈھونڈتا ہے، بہن کو ڈھونڈتا ہے مگر اسے اپنا کوئی نظر نہیں آتا۔ اس کی خوفزدہ آنکھوں میں ایک ہی التجا ہے۔ مجھے بچا لو، مجھے بچا لو، مجھے موت سے بچا لو، وہ تڑپتا ہے تو زخموں سے درد کی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ اسے ہر سو موت نظر آتی ہے۔ وہ کراہتا ہے، بلبلاتا ہے۔ اس کی آواز پر نرس بھاگی آتی ہے اس کیفیت میں وہ نرس کو یوں دیکھتا ہے جیسے اس کی زندگی بچانے کے لئے آسمان سے فرشتہ اتر آیا ہو۔ نرس کے روپ اور روپے میں اسے ماں بھی نظر آتی ہے، بہن بھی۔ وہ ڈرے ہوئے بچے کی طرح نرس کی ذات میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اس کے زرد پیلے چہرے کا ایک ایک خط فریاد کرتا ہے.... "میرے سر پر ہاتھ رکھ لو سسٹر! میری بہن چلی نہ جانا، اکیلے ڈر آتا ہے۔ دروازے بند کر دو۔ موت کی آواز آ رہی ہے!"

اس نے آہ بھری اور کہا "آہ انسان کی بے بسی۔ میں نے پانچ برس کے عرصے میں بڑے بڑے کڑیل مردوں کو موت کے خوف سے روتے دیکھا ہے۔ بعض میرا ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر رکھ لیتے ہیں اور گڑگڑا کر پوچھتے ہیں ——— "میں ٹھیک ہو جاؤں گا سسٹر؟" ——— میرے دل کی گہرائی سے آواز اٹھتی ہے۔

"یا خدا! اسے صحت عطا فرما۔ بہت دکھی ہے" ——— میرے دل کی اس آواز کو میرے اور میرے خدا کے سوا کوئی نہیں سن سکتا۔ میں عملاً مریض کے سر پر ہاتھ رکھ لیتی ہوں۔ میں نے بعض کے گال تھام کر انہیں اسی طرح دم دلاسا دیا ہے جس طرح ان کی ماں بہن دیتی، میں کمزور سی عورت ذات موت کی راہ میں چٹان بن کر کھڑی رہتی ہوں۔ جانتی ہوں کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ ہے۔ لیکن مریض کو موت کے سائے تلے دیکھ کر یوں جان پڑتا ہے کہ موت کو شکست دے سکوں گی۔ میں کبھی نہیں کہوں گی کہ جو مریض میرے ہاتھوں میں مر گئے، میں ان کے لئے کچھ نہ کر سکی اور میں یہ بھی نہیں کہوں گی کہ جو صحت یاب ہو کر چلے گئے ان کے لئے میں نے بھی سب کچھ کیا

سب اللہ کے ہاتھ ہے۔ لیکن ہسپتال میں موت کے خلاف جو معرکے لڑے جاتے ہیں۔ ان میں میرے خون پسینے، چپ چاپ آہوں، خاموش دعاؤں اور شب بیداریوں کا حصہ ہوتا ہے۔ میں جب کسی جاں بلب مریض کے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر اور مسکرا کر کہتی ہوں کہ تم اچھے ہو جاؤ گے تو اس کے حوصلے ترو تازہ ہو جاتے ہیں۔ میری مسکراہٹ سے اس کی یاسیت ڈھل جاتی ہے میں اس کے لئے زندگی کا ہنستا مسکراتا پیغام بن جاتی ہوں۔ مگر بھائی جان! ..... اس نے کہا — ایک روز آتا ہے کہ میرا مریض اٹھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ چلنے پھرنے لگتا ہے اور مسکرانے بھی لگتا ہے۔ جب میری اور اس کی مسکراہٹوں کا تصادم ہوتا ہے تو وہ نہ مریض رہتا ہے نہ میں مسیحا۔ نہ وہ ڈرا ہوا بچہ نہ میں ماں یا بہن، وہ مرد بن جاتا ہے اور میں عورت —

جوان لڑکی —— مریض عشق و محبت کی گھٹیا سی فلم کا ہیرو بن جاتا ہے اور مجھے اس کہانی کی ہیروئن سمجھنے لگتا ہے۔ میری مسکراہٹ جو موت کا منہ چڑاتی رہی تھی۔ اب میرا منہ چڑانے لگتی ہے..... بھائی جان! ایک بات کہنے دیجئے۔"

ضرور کہئے۔"

کوئی جواں سال عورت کسی مرد کی طرف دیکھ کر خواہ بے خیالی میں ہی گردن کو ذرا سا خم دے دے تو مرد اُلو بن جاتا ہے۔" اس نے کہا" اور اگر عورت ساتھ ہی مسکرا دے تو مرد اُلو کا پٹھا بن جاتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بدصورت اور کالے کلوٹے آدمی بہت جلدی اور زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

"آپ مجھے مریضوں کی قسمیں بتائیں۔" میں نے کہا "مردوں کی قسمیں تو میں بھی جانتا ہوں۔"

"ہر مرد مریض ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔" ایک وہ ہیں جو طرح طرح کے امراض سے یا حادثے کا شکار ہو کر ہسپتالوں میں آتے ہیں اور جو باہر سڑکوں پر گھومتے پھرتے ہیں۔ ان کے دماغ خراب ہوتے ہیں۔ ذرا اس دبلے پتلے، ہڈیوں کے ڈھانچے، تنگ پتلون میں پھنسے ہوئے مریل سے نوجوان کا تصور کیجئے جو فٹ پاتھ پر کھڑا کبھی اپنے سائے کو دیکھتا ہے، کبھی گذرتی کاروں، ٹیکسیوں اور بسوں کی اگلی سیٹوں کو گھورتا ہے۔ اسے اسی فٹ پاتھ پر تین چار لڑکیاں اپنی طرف آتی نظر آتی ہیں۔ یہ بانس کی ٹانگوں والا مریل یوں چونک اٹھتا ہے جیسے رکھوالی کا کتا رات کو کسی آواز پر کان کھڑے کر لیتا ہے۔ وہ فوراً اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرتا ہے، وہیں سے اس کے ہاتھ پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں پہ جاتے ہیں۔ وہ بالوں کو اور زیادہ بکھیر کر اپنی مردانگی پر بالکل ہی پردہ ڈال لیتا ہے۔ اتنے میں لڑکیاں اسے بجلی کا کھمبا سمجھ کر قریب سے گذر جاتی ہیں اور وہ انہیں یوں کنکھیوں سے دیکھتا رہتا ہے جیسے ان میں سے کوئی لڑکی تو لنڈے سے خریدی ہوئی چھ آنے کی امریکی ٹائی پر ضرور مر مٹے گی۔ مگر لڑکیاں اس کی طرف دیکھے بغیر اگلے کھمبے کے قریب سے گذر رہی ہوتی ہیں.... ایک یا دو نوجوان نہیں، یوں لگتا ہے جیسے قوم کی اگلی نسل ہی فٹ پاتھوں پر کھڑی رال ٹپکا رہی ہے۔ کسی کا قد ساڑھے چار فٹ سے اوپر ایک انچ نہیں بڑھتا جسم ہڈیوں کے ڈھانچے، سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں چہروں کی پیلاہٹ جوانی کے خاتمے کا پتہ دیتی ہے۔ ہوا تیز چلنے لگے تو ان کا پاؤں پر کھڑے رہنا محال ہو جاتا ہے۔ امریکہ، برطانیہ کی ننگی اور سٹنٹ فلموں کے مارے ہوئے یہ پاکستانی ہیرو ہر لمحہ یہ توقع لئے راہوں میں کھڑے رہتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی لڑکی ان پہ عاشق ہو جائے گی۔" وہ چپ ہو گئی اور مجھے بڑی غور سے دیکھ کر پوچھنے لگی۔" کہئے آپ میری ساری باتیں انٹرویو

مردوں کی اگلی نسل دیکھ کر مجھے ان پر نہیں، پاکستان پر رحم آنے لگتا ہے!

میں لکھیں گے ؟"

"ضرور لکھوں گا" میں نے کہا "میرے ذہن میں آپ کے انٹرویو کی شکل وصورت کچھ اور تھی لیکن آپ خلاف توقع سنجیدہ باتیں کر رہی ہیں۔ حالانکہ آپ کی عمر کی لڑکی سے ایسی سنجیدگی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔"

اس عمر میں ہی نہیں" اس نے کہا "میں تو چھ برس کی عمر میں ہی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ میں پٹھان کوٹ کی رہنے والی ہوں۔ سن سنتالیس میں میری عمر صرف چھ برس تھی۔ جب میں ماں باپ کے ساتھ پاپیادہ لاہور پہنچی تھی۔ میری ایک بہن نو برس کی تھی اور ایک بھائی ڈیڑھ برس کا۔ ماں اور باپ ہم بچوں کو کندھوں پر اٹھا کے چلتے رہے۔ ہمارے عقب میں مسلمانوں کے جلتے ہوئے مکانوں کے شعلے تھے، راستے میں مہاجروں کے پہلے قافلوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں، ہر طرف موت کے جے کارے اور خون کی بو تھی۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ دہشت نے مجھ چھ برس کی بچی کی ذہنی کیفیت کیا بنا رکھی تھی۔ راستے میں شائد دوسرے دن ابا جان چلتے چلتے بیٹھ گئے۔ اس عمر میں تو کچھ سمجھ سکی۔ برسوں بعد امی نے بتایا کہ ابا جان کو تھکان اور شہیدوں کے صدمے سے بخار آنے لگا تھا۔ مجھے میرے ایک محلہ دار نے کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔ وہ باری باری مجھے اور میری بہن کو اٹھاتا رہا۔ میں میل میل بھر پیدل بھی چلی۔

راستے میں دو اور آدمی ساتھ ہو گئے۔ ان کے ساتھ عورتیں اور بچے نہیں تھے۔ انہوں نے بھی ہم تینوں بچوں کو باری باری اٹھایا اور ابا جان کو سہارا دیکر مسافت طے کرتے رہے پھر ہمارے ساتھ کئی اور مرد اور عورتیں آ ملیں۔ باری باری سب نے مجھے کندھوں پہ اٹھایا اور ہم لاہور پہنچ گئے۔ مہاجر کیمپ میں پہنچتے ہی ابا جان بخار میں ایسے گرے کہ فوت ہو گئے۔ وہ ہولناک منظر آج بھی کل کی بات کی طرح میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ابا جان مر رہے تھے، اور میں حیران و پریشان کھڑی دیکھ رہی تھی ان کی میت کے گرد مردوں کا سوگوار ہجوم تھا۔ ابا جان تو نہ رہے لیکن اس ہجوم نے ہمارے سروں پر ہاتھ رکھ لئے۔ میرے ذہن میں اسی عمر میں دو چیزیں نقش ہو گئیں ——— ایک یہ عزم کہ بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور مرد کو مرنے نہ دوں گی۔ دوسری یہ کہ پاکستان کے تمام مرد میرے باپ اور بھائی ہیں جو مجھے اور میرے بہن بھائی کو کندھوں پہ اٹھا کر پاکستان لائے تھے۔

یہ ایک لمبی داستان ہے کہ ماں نے ہمیں کس طرح پالا اور میں نے کس طرح میٹرک پاس کیا۔ ڈاکٹری تو خواب تھا، نرس بن گئی۔ سوچا، چلو یہی کافی ہے، علاج نہ سہی، تیمارداری ہی سہی۔ میں ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کے ہاں ملازم ہوئی۔ وہ مشفق بزرگ ہیں ان کے ہاں ایک ادھیڑ عمر مجھ سے دگنی عمر کا، مریض آیا کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک روز مجھے کہا کہ انہیں ایک روز چھوڑ کر ان کے گھر انجکشن کر آیا کروں اور پیسے تم رکھ لیا کرو۔ مجھے دراصل پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔ اپنی ماں اور بہن بھائیوں کے لئے مجھے سہارا ابھی بننا تھا۔ اس مریض کو دیکھ کر مجھے ابا جان یاد آ گئے تھے۔ میں اس کے گھر جا کر اسے انجکشن دینے لگی۔ اس مریض کے جسم سے مجھے اپنے باپ کے بدن کی بو آتی تھی۔ ایک روز اس نے مجھے پلنگ پر بٹھا لیا۔ میں بیٹھ گئی۔ بیٹی باپ کے پاس بیٹھا ہی کرتی ہے۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور سوچا کہ ابا جان زندہ ہوتے تو وہ میرا ہاتھ اسی طرح پیار سے اپنے ہاتھ میں مسلتے۔ اس کا ہاتھ میرے بازو تک آن پہنچا۔ پھر اس کا ہاتھ اور آگے آیا تو میں چونکی اور ذرا ہی دیر میں اسی شخص نے مجھ پر واضح کر دیا کہ میں اس بیٹی نہیں ——— وہ غیر مرد تھا اور میں جوان لڑکی ——— اس نے مجھے جوانی کا احساس دلا دیا اور جب اس نے مسکرا کر کہا۔ تم آتی ہو تو میں اچھا بھلا ہو جاتا ہوں ——— تو اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں مجھے ہوس کا رمرد صاف نظر آ گیا ——— آہ! میرا باپ مر گیا تھا۔ میں یتیم لڑکی تھی۔"

اس کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ آنسوؤں کو روکنے کی سر توڑ کوشش کر رہی ہے۔ پھر اس نے مسکرا کر کہا ——

"وقت گذرتا گیا۔ میں بغیر برقعے کے باہر نکلا کرتی تھی۔ اس

مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ میں جوان ہوں یا میری شکل و صورت کیسی ہے

لئے نہیں کہ میں بے پردہ تھی بلکہ اس لئے کہ میرے پاس برقعے کے لئے پیسے ہی کبھی نہیں ہوئے تھے۔ مجھے تو کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ میں جوان ہوں یا میری شکل و صورت کیسی ہے۔

اپنے عزم اور گھر چلانے کے لئے چند روپے کمانے کی فکر نے اتنی فرصت ہی کہاں دی تھی۔ میں سڑکوں پر، گلیوں میں اور ہر طرف گھومتے پھرتے نوجوانوں کو اپنا بھائی اور بڑوں کو اپنا باپ سمجھا کرتی تھی۔ لیکن ان ہی گلیوں میں اور سڑکوں پر اور بسوں کے اسٹاپوں پر ان باپوں اور بھائیوں نے فلمی گیتوں مصنوعی چھینکوں، فحش جملوں، اداکارانہ آہوں، آنکھوں کے بے ہودہ اشاروں اور چھیڑ خانی کی زبان میں مجھ پر واضح کر دیا کہ میں کسی کی بہن نہیں، نہ کسی کی بیٹی ہوں.....

مجھے وہ مرد یاد آئے جو مجھے اور مجھ جیسی جانے کتنی بچیوں کو پٹھان کوٹ اور نہ جانے کہاں کہاں سے کندھوں پر اٹھا کر پاکستان پہنچے تھے۔ وہ فاتح مرد تھے۔ ان میں سے بیشتر اپنے شہیدوں کے خون کا انتقام لے کے آئے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو پاکستان کے نام پر اپنے بچے ذبح کروا آئے تھے مگر انہی فاتح مردوں کی اگلی نسل کی غلاظت کو دیکھا تو مجھے ان پر نہیں پاکستان پر رحم آنے لگا۔ اور بھائی جان! اس نے فکر مند لہجے میں کہا "جب سے بدکاری کا اڈہ بند ہوا ہے سڑکوں پر چلنا محال ہو گیا ہے۔ جس اسٹاپ پر ہم چند ایک لڑکیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ ان میں ہمارے ہی روپ اور لباس میں ایک دو طوائفیں بھی کھڑی ہوتی ہیں۔ مردوں کو اس حقیقت کا علم ہے کہ جو چیز صرف ایک جگہ سے ملتی تھی۔ اب جگہ جگہ دستیاب ہو جاتی ہے۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے سارا شہر بدکاری کا کھلا اڈہ بن گیا ہے اور مرد سڑکوں پر گھومتی ہر عورت کو طوائف سمجھنے لگے ہیں شام کے بعد کوئی نہ کوئی پاس سے گذرتے سرگوشی کرتا ہے ——، چلتی ہو؟ یا یہ کہ —— آؤ۔ گاڑی ہے۔

سوچتی ہوں کہ اس قانون کا مقصد کیا تھا؟ گناہ کا خاتمہ یا گناہ کو ایک جگہ سے اٹھا کر سارے شہر میں پھیلا دینا؟

"ان ہی نوجوانوں میں سے جو بازاروں اور سڑکوں پر ہمارے لئے وبال جان بنے رہتے ہیں۔ جب کوئی سکوٹر یا سائیکل کو ٹرک سے ٹکرا کر بے ہوشی کی حالت میں ہمارے پاس پہنچتا ہے اور اس کے جینے کی ذرہ بھر آس نہیں ہوتی۔ اس وقت میرے اور ہر نرس کے سینے سے خاموش فریادیں نکلتی ہیں۔ "یا اللہ! اسے بچا لینا کسی بہن کا بھائی ہے، کسی ماں کا جوان بیٹا ہے —— اور نرس رات کو رہ رہ کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتی ہے کہ غشی میں کہیں موت کا داؤ تو نہیں چل گیا؟ نرس جانتی ہے کہ یہ ٹھیک ہو کر میرے ہی پیچھے سیٹیاں بجاتا اور فلمی گیت الاپتا پھرے گا۔ لیکن ہسپتال میں نرس اس کے لئے ماں بھی ہوتی ہے، بہن بھی۔ جب ان مریضوں میں سے کوئی جاں بحق ہو جاتا ہے تو اس وقت نرس کی ہاری ہوئی آہوں کو کوئی نہیں دیکھ سکتا نہ کوئی اس کے آنسوؤں کو دیکھ سکتا ہے جو وہ کسی مریض کی موت پر تنہائی میں چھپ کے بہاتی ہے لیکن وارڈ میں آتی ہے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ کوئی بھی نہیں جان سکتا کہ نرس کی مسکراہٹ میں کتنے آنسو کتنی فریادیں، کتنی دعائیں اور کتنے شکوے چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔

"بعض نرسیں تو اکھڑ مزاج ہوتی ہیں"۔ میں نے کہا۔ "مریض کے ساتھ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتیں"۔

"ضرور ہوتی ہیں"۔ اس نے کہا "لیکن ایسی نرسوں کی تعداد کتنی ہے؟ ان چند ایک نرسوں کی وجہ سے آپ نرسنگ کے

پیشے کو تو رسوا نہیں کر سکتے! ہمارے ساتھ ایک نرس ہے وہ غاضی بدزبان مشہور ہے لیکن وہ ایسی نہیں ہوا کرتی تھی ہوا یوں کہ اس کے رشتے کی بات چل رہی تھی لڑکے کے ماں باپ اسے پسند کرتے تھے لیکن بات اچانک رک گئی چند دنوں بعد اس نرس کو پتہ چل گیا کہ جب لڑکے کو علم ہوا کہ اس کا رشتہ ایک کے ساتھ ہو رہا ہے تو اس نے بڑی نفرت سے کہا ——"میں نرس کے ساتھ شادی نہیں کروں گا، کسی شریف لڑکی سے کروں گا"—— اس نرس کا ردعمل پہلے تو یہ تھا کہ روتی رہتی تھی۔ اس لئے نہیں کہ اس کا رشتہ ٹوٹ گیا تھا بلکہ اس لئے کہ اس انداز سے نرس کہا گیا تھا جیسے کسی شریف عورت کو طوائف کہہ دیا جائے۔ اس میں یک لخت تبدیلی آئی اور اس کے مزاج میں نہ بردباری رہی نہ تحمل... جنھیں آپ اکھڑ کہتے ہیں، کون جانے وہ اکھڑ کیوں ہیں۔؟

اب آپ یہ بھی کہئے کہ بعض نرسیں شریف بھی نہیں ہوتیں میں یہ بھی مان لیتی ہوں لیکن آپ یہ نہ بھولئے کہ نرس اسی معاشرے کی عورت ہے جس کی بنیادوں میں مرد نے فحاشی، فیشن، دولت غیر ملکی عریاں فلمیں اور لالچ بھر دیا ہے۔ ہر طرف انگیخت ہے۔ میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں کہ علمی رنگ میں بات کر سکوں۔ میرے سامنے ذاتی تجربے اور مشاہدے ہیں۔ ایک لڑکی کو جب کوئی آدمی کار میں بٹھا کر کہتا ہے کہ تم تو کسی بنگلے میں رہنے والی لگتی ہو لیکن .... اس، لیکن، سے آگے وہ جال پھیلا ہوا ہے۔ جس میں بعض لڑکیاں الجھ جاتی ہیں۔ انہیں ٹیلی ویژن، فرج اور بنگلے کے خواب دکھائے جاتے ہیں۔ انہیں انگریزی فلمیں دکھائی جاتی ہیں جوان لڑکیوں کی شرم وحیا کو ختم کر دیتی ہیں پھر انہیں پاکستانی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ جہاں انہیں محبت کرنے کے ڈھنگ سکھائے جاتے ہیں۔ صبح سے شام تک ریڈیو پر سرکاری طور پر انہیں ایسے گانے سنوائے جاتے ہیں جو رہی سہی شرم بھی ختم کر دیتے ہیں۔ اس شرمناک طوفان کو ختم کرنے کے لئے نہ کوئی سرکاری کوشش ہوتی ہے نہ غیر سرکاری۔ چنانچہ آئے دن کوئی نہ کوئی لڑکی اس لپیٹ میں آجاتی ہے۔ وہ بنگلے کے خواب دیکھتے دیکھتے جانے کتنے بنگلوں میں گھومنے لگتی ہے۔ آج یہاں، کل وہاں، آج اس کار میں، کل اس اسکوٹر پر۔ یہ اسی مرد کی کارستانی ہے جس نے قحبہ خانے آباد کئے۔ پھر ان کی رونق بڑھانے میں

پانچ برس گزر چکے ہیں اور پگ پگ
میرے بھائی اور باپ مجھے
یاد دلاتے رہتے ہیں کہ
میں جوان اور دلکش ہوں!

لگا رہا۔ تالون نے اٹھ کر اس رونق کے ذروں کو سارے شہر میں بکھیر دیا اور اب مرد اسی رونق کے بکھرے ہوئے ذروں کو ڈھونڈتا ہر شریف عورت کو اسی آسمان کا ٹوٹا ہوا تارا سمجھنے لگا ہے.....

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہر قباحت کا ذمہ دار مرد ہے"؟ میں نے کہا۔

"صرف میری مثال لیجئے"۔ اس نے کہا۔ "اور نہ جانے ایسی کتنی اور مثالیں ہوں گی۔ مجھے بخدا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ میں جوان ہوں مگر یہ احساس اس نے مجھے دلایا جسے میں باپ سمجھتی تھی۔ پانچ برس گذر گئے ہیں اور پگ پگ میرے بھائی اور میرے باپ مجھے یاد دلاتے رہتے ہیں کہ میں جوان بھی ہوں دلکش بھی اور میں ذرا جتنی تنخواہ پر اس

قدر غلیظ ماحول میں اپنی جوانی تباہ کر رہی ہوں.....
ابتدا میں تو میں کڑھنے بیٹھ جایا کرتی تھی۔ لیکن پرانی نرسوں کو پتہ چلا تو انہوں نے بتایا کہ یہ تو روزمرہ زندگی کے لطیفے ہیں اور لڑکیوں کو دیکھ کر کھانستے چھینکتے مرد تو چلتے پھرتے

**لڑکیوں کو دیکھ کر
کھانستے چھینکتے مرد کو چلتے
پھرتے کارٹون ہیں، نہیں
اس حیثیت میں دیکھ کر
تمہیں کڑھنے کی بجائے
ہنسی آئے گی۔**

کارٹون ہیں۔ انہیں اسی حیثیت سے دیکھو تو کڑھنے کی بجائے تمہیں ہنسی آنے لگے گی۔ یہاں تو ہر اس عورت کا حال یہی ہوتا ہے جو گھر سے نکل کر کہیں کام کرنے جاتی ہے سکول کی استانیوں سے پوچھ لو۔ ٹیلیفون اوپریٹر لڑکیوں سے بات کر دیکھو، مختلف دفتروں میں جو لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ ان کے دل کھول کے دیکھو۔ تمہیں ہر لڑکی کی زبان سے وہی آپ بیتی سنائی دے گی جو تم پر بیت رہی ہے۔

"میں سنبھل گئی اور اب میں پتھر بن گئی ہوں ــــ وارڈوں میں چلتا پھرتا مسکراتا ہوا پتھر.....،،

"کیا آپ نے کبھی سوچا کہ اس قباحت کا حل کیا ہو سکتا ہے"؟

کبھی نہیں۔" اس نے کہا۔" میرے سامنے اس کا ایک ہی حل ہے کہ عورت اپنے عزم اور اپنے وقار کو خود پہچانے

" وہ ہی گہری سوچ میں ڈوب گئی پھر سوالیہ لہجے میں بولی ــــ "جنگ کے دوران جس طرح فضا میں پاکیزگی آگئی تھی اگر وہ پھر پیدا کی جا سکے تو؟....

" پھر ۔ جنگ چھیڑ دی جائے؟" میں نے کہا۔

"بالکل نہیں ..... ،، اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا" جن نرسوں نے جنگ کے زخمی فوجیوں اور شہریوں کی تیمارداری کی ہے۔ ان کی روح میں جھانک کر دیکھو تو نمایاں حروف میں لکھا ہوا نظر آئے گا ــــ خدا نہ کرے، جنگ ہو ــــ ہم نرسوں نے بڑے بڑے گھبرو جوانوں کے بازو اور ٹانگیں کٹی ہوئی دیکھی ہیں، قیمہ کئے ہوئے جسم دیکھے ہیں، میں نے بچوں اور عورتوں کو بمباری سے مرتے دیکھا ہے بہت سے عمر بھر کے لئے معذور ہو گئے ہیں میں لاہور چھاؤنی کے ہسپتال میں رہی ہوں جہاں محاذ کے زخمی لائے جاتے تھے۔ میں تو یہی کہوں گی کہ جنگ نہیں ہونی چاہئے لیکن میں ہسپتالوں میں ہیبت کی جگہ تقدس محسوس کیا کرتی تھی جسم کٹوا کر پاک فوج کے جانباز اپریشن ٹیبل پر اور وارڈوں میں بھی نعرے لگاتے تھے۔ میں نے گولہ باری کی زخمی عورتوں کو بھی دیکھا ہے۔ ان کا جذبہ اور جوش و خروش سپاہیوں سے کم نہ تھا۔

" سب سے زیادہ قابل قدر بات یہ تھی کہ میں کئی بار رات کی تاریکی میں تن تنہا ہسپتال سے گھر آئی اور گئی بھی دن کے وقت بھی راستے میں مرد ملتے رہتے تھے۔ ان میں نوجوان بھی ہوتے تھے لیکن راہ جاتی لڑکیوں کو چھیڑ کر خوش ہونے والوں کو جیسے معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کے قریب سے ایک لڑکی گذر رہی ہے۔ ایسی ہی ایک رات تھی کہ میرے کپڑے خون سے بری طرح لتھڑ گئے تھے۔ اس روز بہت زخمی آئے تھے نصف رات سے ذرا پہلے ڈاکٹر نے کہا کہ جاؤ کپڑے بدل آؤ۔ اس نے مجھے گاڑی دیدی۔ بلیک آؤٹ کا گھپ اندھیرا تھا۔ سڑکوں پر انسانی زندگی کا نشان تک نہ تھا گاڑی موڑ مڑی تو اچانک سامنے سے اور گاڑی آگئی۔ دونوں ڈرائیوروں نے پوری طاقت سے بریکیں لگائیں۔ خوف سے میری چیخ نکل گئی۔ گاڑیوں کے بمپر ایک دوسرے سے مل چکے تھے لیکن خیریت رہی۔ میری چیخ سن کر دوسری گاڑی

سے دو آدمی کود کر باہر نکلے۔ اتنی رات گئے عورت کی چیخ معمولی بات نہیں تھی۔ ایک نے پوچھا ——— "آپ کون ہیں؟" ——— میں نے بتایا کہ میں نرس ہوں، ہسپتال سے آئی ہوں اور کپڑے بدل کر واپس آجاؤں گی۔ وہ دونوں فوجی تھے ایک نے کہا ——— "زندہ باد! جس قوم کی بیٹیوں کو اپنے مجاہدوں سے اتنی محبت ہو اس قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ میں تمہیں سیلوٹ کرتا ہوں ——— دونوں نے مجھے سیلوٹ کیا۔ میرے آنسو نکل آئے ——— نرس کو پہلی بار خراج تحسین پیش کیا گیا تھا اور مجھے اپنی اہمیت اور نرس کے تقدس کا پہلی بار احساس ہوا....

جن سپاہیوں کے ہاتھ زخمی تھے۔ میں ان کے سر گود میں رکھ کر انہیں چمچ سے دودھ پلایا کرتی تھی۔ میں ہی نہیں، ہر نرس کا انداز یہی تھا۔ وہ رات رات بھر زخمیوں کے ساتھ جاگتی تھیں۔ دن کو بھی آرام نہ کرتی تھیں۔ ہوائی حملے کی صورت میں ہمیں ہدایت تھی کہ فوراً خندقوں میں چلی جائیں لیکن سائرن بجتا تھا تو نرسیں زخمیوں کو اکیلا نہیں چھوڑتی تھیں۔ ان کے ساتھ وارڈوں میں ہی رہتی تھیں عجیب وقت اور انوکھی سی فضا تھی۔ خون اور خطروں میں رہ کر روحانی سا قرار آتا تھا مگر ....." وہ بولتے بولتے اکھڑ گئی اور یوں چپ ہو کے سوچنے لگی جیسے الفاظ ڈھونڈ رہی ہو۔ کہنے لگی ——— "... مگر آج میں پھر الجھ گئی ہوں زخمیوں کی ابتدائی حالت یاد آتی ہے تو کہتی ہوں کہ جنگ کبھی نہ ہو ان کے نعرے اور اٹھ اٹھ کے محاذ پر لوٹ جانے کی تڑپ یاد آجاتی ہے تو کہتی ہوں کہ بات قوم کی خودداری اور ملک کے وقار کی آجائے تو کٹ مرنا چاہیئے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم کئی نرسوں نے یہ پیش کش بھی کی تھی کہ ہمیں محاذ پر بھیج دیا جائے تاکہ ابتدائی مرہم پٹی ہم وہیں کر دیا کریں۔ جب یہ ولولہ انگیزیاں یاد آتی ہیں تو کہتی ہوں کہ جنگ بے مقصد نہیں تھی۔ مقصد حل ہونے تک یہ جنگ جاری رہنی چاہیئے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہر جگہ اکٹھے کام میں یوں محو نظر آتی تھیں جیسے ایک ماں کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہوں۔ ایک بڑا ہی پاک مقصد سامنے آگیا تھا۔ مگر ایک روز اچانک ہمارے سبز جھنڈے کا رنگ سفید ہو گیا اور معاً بعد مردوں کی آنکھیں بھی سفید ہو گئیں قوم پھر بھٹکنے لگی۔ ایک سوالیہ نشان درانتی کی طرح ہمارے سینوں سے جذبے اور ولولے کاٹنے لگا۔ آج ہم سب یوں کھوئے کھوئے سے ہر سو دیکھ رہے ہیں جیسے کوئی چیز کہیں رکھ کے بھول گئے ہوں۔ وہ چیز کیا تھی؟ یہ بھی یاد نہیں رہا۔ وہ رکھی کہاں تھی؟ یہ بھی یاد نہیں رہا۔

اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور الجھے الجھے سے لہجے میں کہنے لگی "بھائی جان! مجھے کچھ پتے نہیں پڑتا۔ میں سمجھتی ہوں.... میں.... شائد کچھ بھی نہیں سمجھتی۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ قوم کے یہ سپوت جو دن بھر راہوں میں کھڑے لڑکیوں کو گھورتے رہتے ہیں، وہ بے قصور ہیں۔ ان کی آوارہ منشی لگاہوں میں مجھے کچھ ایسا تاثر نظر آتا ہے جیسے پوچھ رہے ہوں۔ "ہم اور کیا کریں؟" ——— مجھے یاد ہے کہ یہی لڑکے بمباری کے زخمیوں کو کندھوں پر اٹھا کر ہسپتالوں میں لاتے تھے اور رات رات بھر سوتے نہیں تھے کہ جونہی کہیں بم گرے وہ زخمیوں کو فوراً ہسپتال پہنچا دیں۔ انہوں نے ہسپتالوں میں نرسوں کے ساتھ بھی کام کیا ہے.... میں تو سمجھتی ہوں کہ جس قوم سے رزمیہ نغمے اور ملی ترانے چھین کر

ہم کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں

اسے دن رات عشقیہ گانے سنائے جائیں وہ قوم اپنی بہو بیٹیوں کی آبرو کے تقدس کو کیا خاک سمجھے گی؟"

جب میں جانے کے لئے اٹھا تو میں نے کہا۔ اگر مجھے انٹرویو کے ساتھ تصویر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو میں مونچھوں والے اس نرسنگ سپاہی کی تصویر دینا پسند کروں گا۔ جس کے خون سے میرا زخم بڑی جلدی ٹھیک ہو گیا تھا۔

چاچا شکور

ترسٹھ سالہ شکور چاچا گزشتہ دس سال سے کالج یونین میں ملازم ہے۔ شکور چاچا جگت چچا ہیں۔ خوش اخلاقی اور احساس ذمہ داری ان کی دو اہم خصوصیات ہیں۔ ان دس سالوں کے دوران یونین دس صدر دیکھ چکی ہے۔ لیکن شکور چاچا خود یونین کو دس سال سے دیکھ رہے ہیں۔ یونین ناکام ہو یا کامیاب شکور چاچا فرائض کی مناسب انجام دہی کے عوض ہر سال ایک تعریفی سرٹیفکٹ لے لیتے ہیں۔

شکور چاچا ایک مدبّر آدمی ہیں۔ ان کے چھ بچے اور ایک بیوی ہے۔ لیکن ان کی تنخواہ نہایت قلیل یعنی صرف پچانوے روپے ہے۔ شروع میں اُن کی تنخواہ صرف تیس روپے تھی۔ تنخواہ میں اضافے کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے ــــ "بس دس بیس بڑھ جائے تو مجھے اور کیا چاہیئے۔"

اُن کی خدمات کے بدلے میں اگر یہ چھوٹی سی خواہش پوری کر دی جائے تو کیا حرج ہے؟

تاج محمّد

اگر آپ کو کبھی اسٹوڈنٹ وارڈ میں جانے کا اتفاق ہوا ہے تو تاج محمد کو آپ ضرور جانتے ہوں گے۔

تاج محمد کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ہر کام پونے دو منٹ میں کرتا ہے۔ وہ گزشتہ پانچ سال سے اسٹوڈنٹ وارڈ میں طلبا کی خدمت کر رہا ہے۔ یعنی طالب علموں کی ایک کھیپ اس کے سامنے ڈاکٹر بن گئی ہے۔ تاج محمد کی تنخواہ اس عرصے میں صرف ۸۰ سے ۱۱۸ تک پہنچی ہے۔

تمہاری تنخواہ زیادہ سے زیادہ کتنی ہونی چاہیئے؟

۱۵۰ روپے

اور جب بچے ہو جائیں تو۔؟

پھر فی بچہ ۳۰ روپے بڑھا دیں۔ ویسے فی الحال تو کوئی بچہ نہیں۔ ہاں انتظام ہو رہا ہے۔ منگنی ہو گئی ہے۔ شادی بھی ہو جاتی لیکن لڑکی کے چچا جان ——

اس نے پوری تفصیل بتائی۔

میرے کچھ سوالوں کے جواب تاج محمد نے اس طرح دیئے۔

لڑکے اچھے ہوتے ہیں۔

لڑکیاں اچھی ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر اچھے ہوتے ہیں۔

نرسیں اچھی ہوتی ہیں۔

تو پھر برا کون ہوتا ہے؟

آدمی خود اچھا ہو تو کوئی برا نہیں ہوتا۔

تاج محمّد کی ایک خواہش ہے کہ جب تک ہسپتال میں ملازم رہے صرف اسٹوڈنٹس وارڈ میں کام کرے۔

ہسٹریا یا آسیب

SCANNED BY
OFFICES OF
AMIN H. KARIM
MD

ڈاکٹر کیپٹن اختر راز

سابق ہاؤس سرجن میو ہسپتال لاہور

جن یا آسیب جن کے بارے میں خیال پایا جاتا ہے کہ وہ نار کی پیداوار ہیں۔ قرآن شریف میں بعض مقامات پر انسان کے ساتھ ساتھ جنوں کا ذکر بھی آیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی مخلوق ہے۔ اور زمین ہی پر بستی ہے یہاں تک تو کسی کو اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن اس کے بعد طرح طرح کی روایات جنات سے منسوب کی جاتی ہیں جن کے بارے میں شکوک و شبہات کی کافی گنجائش ہے مثلاً اکثر سننے میں آتا ہے کہ بھئی فلاں مرد یا عورت پر آسیب کا سایہ ہے۔ جب جن یا آسیب حاضر ہوتا ہے مریضہ یا مریض کو دورے پڑنے لگتے ہیں اس طرح کئی قسم کے امراض جو پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں شک کیا جاتا ہے۔ کہ آسیب کی وجہ سے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے جن کو اپنے بس میں کر رکھا ہے۔ اور وہ جو کام چاہیں اُس سے لے سکتے ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ بعض شیطان قسم کے جن انسانوں کو تنگ کرتے کی کوشش کرتے ہیں اور اُن پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ پیشتر اس سے کہ میں اپنی رائے ظاہر کروں۔ چند ایک معتبر واقعات ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ آج سے تقریباً دس سال پیشتر میرے پاس ایک ڈسپنسر تھا جس کا نام نواز احمد تھا اس کا چھوٹا بھائی غالباً آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں وہ کراچی کی سیر کو گیا۔ جب واپس آیا تو اسے اچانک ایک خاص قسم کے دورے پڑنے لگے۔ نواز احمد اور اس کے والدین لڑکے کو میرے پاس لائے۔ تانگے سے اتارا اور چارپائی پر لٹا دیا۔ میں دیکھنے اس کے پاس گیا تو دیکھا کہ اس کی آنکھیں بند ہیں۔ سارا جسم اکڑا ہوا ہے۔ دونوں ہاتھ سینے پر قلب کے مقام پر رکھے ہیں۔ ہر دو تین منٹ بعد اُسے تشنج کا دورہ پڑتا اور سارا جسم ایسے مروڑا جاتا۔ جیسے کپڑا نچوڑنے کے لئے مروڑا جاتا ہے۔ میں نے اچھی طرح سے اُسے دیکھا۔ معائنہ کیا لیکن مجھے ان دوروں کی کوئی وجہ نظر نہ آئی۔ دل کی حرکت پر کوئی اثر نہیں تھا۔ نبض ٹھیک تھی میں نے اُس سے بات کرنی چاہی لیکن اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور نہ ہی مجھے پہچانا۔ میں نے ہسٹریا کا مرض تشخیص کیا۔ اور اسی کے مطابق علاج شروع کیا۔ لیکن ہسٹریا کے علاج

کے بارے میں مجھے زیادہ تجربہ اس وقت نہیں تھا۔ تشنج رد کرنے کے لیئے انتہائی ممکن ادویات استعمال کی گئیں بلکہ مارفیا کا ٹیکہ تک بھی لگا دیا گیا۔ لیکن اس کے دورے اور سینے کا درد بدستور رہا۔ ایک اور علاج بذریعہ بانی تحریک۔ یعنی (SUGGESTION) ہسٹریا کے علاج میں بہت اہم مانا جاتا ہے۔ لیکن اس کی طرف میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ کیونکہ اس کے لیئے اونچی آواز سے بولنا پڑتا ہے۔ اور کچھ وقت بھی خرچ ہوتا ہے۔ اور تیسرے مجھے اس کا پورا تجربہ نہ تھا۔ جب دو دن کے علاج میں مریض کو کوئی فائدہ نہ ہوا اور دورے بدستور پڑتے رہے تو لواحقین نے ادھر ادھر بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ کیونکہ اس تمام دور میں مریض نے نہ کچھ کھایا اور نہ آرام کیا اس بھاگ دوڑ میں انہیں ایک قاری صاحب ملے جن کا نام مجھے یاد نہیں آرہا۔ یہ قاری صاحب مصری شاہ لاہور میں رہتے تھے انہوں نے بغیر مریض کو دیکھے فتویٰ دیا کہ یہ آسیب کی شکایت معلوم ہوتی ہے میں نماز عشاء سے فارغ ہو کر آؤں گا۔ اور اس آسیب سے نمٹوں گا۔ روایت کہنے والوں کے مطابق قاری صاحب تقریباً دو گھنٹے تک لڑکے یا پھر دوسرے لفظوں میں آسیب کے پیچھے پڑے رہے اور لڑکے بھلا چنگا کر کے چھوڑا۔ لڑکے کی تمام علامتیں غائب ہو گیئں۔ لڑکے نے کھانا مانگا۔ کھایا۔ پانی پیا۔ اور تقریباً پانچ دن کے بعد چین کا سانس لیا۔ اور سوجھ بوجھ کی باتیں کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ کراچی میں اس نے ایک خاص جگہ پیشاب کر دیا تھا۔ جہاں سے اسے یہ آسیب لگ گیا تھا۔

۲۔ مندرجہ بالا واقعہ کے تقریباً ایک سال بعد کی بات ہے میں ان دنوں وسن پورہ لاہور میں اقامت گزیں تھا۔ ہمارے ایک پڑوسی تھے جو کہ بٹ صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ پورا نام مجھے اب یاد نہیں آرہا۔ پیشہ کے لحاظ سے پراپرٹی ڈیلر تھا ان کی ایک جوان لڑکی ہے جس کی حال میں ہی منگنی ٹوٹ چکی تھی ہمارے ساتھ ان کے خاصے تعلقات تھے۔ ایک رات دس بجے میں اپنے کلینک سے واپس آیا تو بٹ صاحب نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں فوراً باہر آیا تو معلوم ہوا کہ رانی کو دورے پڑ رہے ہیں۔ دوڑا دوڑا اُن کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بالکل ویسے ہی دورے ہیں جیسے کہ اوپر پہلے کیس میں بیان کر چکا ہوں۔ لڑکی تو کچھ نہ بولی لیکن لواحقین نے بتایا کہ اسے سینے میں اور پیٹ میں سخت درد ہوتا ہے۔ لڑکی ۔ دورے کے ساتھ اس طرح مروڑی جاتی تھی جیسے کپڑے کو نچوڑتے وقت بل دیا جاتا ہے ہسٹریا کی تشخیص کرنے میں کوئی دیر نہ لگی۔ لیکن میں نے گھروالوں کو کچھ نہ بتایا اور درد کے علاج کے لئے ٹیکہ براجیبن کا لگایا۔ اور مسکن ادویات یعنی لبریم وغیرہ کھلائیں لیکن درد یا دورے کو کوئی افاقہ نظر نہ آیا۔ تمام رات مختلف تدبیروں میں گذر گئی۔ سحری کے وقت گھر واپس آیا۔ نماز ادا کی۔ شیو کیا اور ناشتہ کر کے پھر اُن کے گھر گیا۔ اور اُن کو اپنی تشخیص بتا دی اور ساتھ ہی انہیں کسی دماغی معالج سے مشورہ کرنے کو کہا۔ چنانچہ وہ رانی کو ایک "سیکاٹرسٹ" دماغی معالج کے پاس لے گئے۔ اس نے مرض ہسٹریا بتایا۔ اور ادویات لکھ دیں۔ دو دن اور گذر گئے اور دورے نہ رکے۔ اس دوران میں لڑکی نے نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ نیند کی۔ تیسری شام کو کلینک پر جانے سے پہلے میں نے بٹ صاحب سے قاری صاحب کا ذکر کیا۔ اور کہا کہ کم از کم قاری صاحب ایسا ایک مریض ٹھیک کر چکے ہیں۔ بٹ صاحب نے اجازت دی کہ انہیں بلوا لیا جائے۔ میں نے انہیں بلوانے کے لیئے اپنے ڈسپنسر کو ان کے پاس بھیجا۔ قاری صاحب حسب معمول دس بجے رات وہاں پہنچ گئے میں بھی اپنی پریکٹس سے فارغ ہو کر پہنچ گیا اور دیکھنے لگا۔

قاری صاحب نے کاغذوں پر کچھ لکھ کر ایک بتی بنا رکھی تھی۔ جو کہ ڈیڑھ انچ موٹی تھی اور تقریباً پانچ انچ لمبی تھی۔ کاغذوں کے علاوہ اس بتی میں کپڑا بھی لپٹا ہوا تھا۔ قاری صاحب نے آتے ہی اعلان کیا کہ یہ ایک ملعون جن کا کارنامہ ہے۔ اور میں اس کو جلا کے رکھ دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ماچس منگوا کر بتی کو آگ دکھائی۔ جب اس سے خوب دھواں اٹھنے لگا تو اُسے رانی کی ناک میں لگا دیا۔ اور سورۃ جن کا ورد کرنے کے بعد فرمایا کہ اے ملعون جن اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ دے ورنہ میں آج تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اور پھر لڑکی سے پوچھنے لگا کہ بتاؤ۔ وہ نظر آیا۔ کوئی گھنٹے بھر کی تگ و دو کے بعد لڑکی کے دورے کم ہوئے اور اس نے بات کا جواب دینا شروع کیا۔ کہنے لگی۔ بہت تنگ کرتا

ہے۔ صورت بہت کریہہ ہے۔ مجھے خراب چیزیں کھانے کو کہتا ہے اور ناجائز تنگ کرتا ہے۔ مارتا ہے اب مرجائے گا وغیرہ وغیرہ۔ قاری صاحب ہر دفعہ ہی اعلان کرتے رہے کہ اب انشاء اللہ ایسا جائے گا کہ پھر مڑ کے نہیں آئے گا اگر آیا تو جلا کے رکھ دوں گا۔ واقعی اس دن کے بعد جن نے رانی کو پریشان نہیں کیا۔

۳۔ اس واقعہ کے چند دن بعد مجھے ایک نیا مریض دیکھنے کا موقع ملا۔ ہمارے محلے میں ہی ایک اور صاحب تھے جن کا بٹ صاحب کے گھر کافی آنا جانا تھا۔ ان کی ایک جوان لڑکی تھی، رانی کی ہم عمر اور سہیلی تھی۔ جب رانی کو دورے پڑ رہے تھے تو وہ اکثر وہاں بیٹھی رہتی تھی۔ رانی کے دورے تھمنے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد اس لڑکی کو بھی ویسے ہی دورے پڑنے لگے۔ دسن پورہ میں ایک ڈاکٹر صاحب پریکٹس کرتے تھے انہوں نے اس لڑکی کا علاج شروع کیا اور ہسٹریا کی تشخیص بتائی۔ انہوں نے مسکن ادویات سے علاج شروع کیا۔ جن میں سو ملی گرام لبریم کا انجکشن بھی شامل تھا۔ تیسرے دن بٹ صاحب مجھے لے کر ان کے گھر پہنچ گئے۔ وہ ڈاکٹر صاحب بھی وہیں موجود تھے اور لڑکی کو سو ملی گرام لبریم کا ٹیکہ لگا رہے تھے اور دورے بدستور پڑ رہے تھے۔ میں نے ان کی تشخیص سے اتفاق کیا اور بتایا کہ مسکن دوائیوں کے ساتھ ساتھ وہم دور کرنے کے لئے تحریک سے کام لیں۔ تب فائدہ ہونے کی امید ہے۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھ کافی سر کھپائی کرتے رہے اور تحریک سے کام لیتے رہے۔ یعنی بار بار کہتے رہے کہ بس اب ٹھیک ہو رہی ہے، اس ٹیکے سے بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ چنانچہ تین دن کی سر کھپائی کے بعد وہ دورے بند کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

۴۔ کوئی پانچ سال کی بات ہے ایک جوان صحت مند لڑکی میرے پاس لائی گئی۔ یہ لوگ قصور سے میرا نام سن کر آئے تھے لڑکی کی والدہ نے بتایا کہ اسے تین سال سے دورے پڑ رہے ہیں لوگ اور سیانے اسے آسیب کا سایہ بتاتے ہیں۔ ہم بہت سیانوں کے پاس اسے لے جا چکے ہیں لیکن اس کے دورے نہیں رکتے اور نہ علاج سے ہی فائدہ ہوتا ہے۔ مجھے ہسٹریا کو پہچاننے میں کوئی دیر نہ لگی۔ اور میں نے شروع ہی سے تحریک سے زیادہ کام لینا شروع کر دیا اور اونچی آواز میں بتانا شروع کیا کہ ہمارے پاس ایک ایسا ٹیکہ ہے جس سے سب جن اور آسیب کافور ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ٹیکہ نیا ہی آیا ہے۔ چنانچہ میں نے "لارجیکٹل" ۵۰ ملی گرام کا ٹیکہ بھرا اور لڑکی کو لٹا کر کولہے پر لگا دیا اور اپنی تحریک جاری رکھی اور اعلان کیا کہ اب دورہ نہیں پڑے گا اور ایسے پانچ ٹیکے لگاؤں گا۔ تو دورے ساری عمر نہیں پڑیں گے۔ چنانچہ واقعی ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن جب لڑکی ٹیکے کے لئے لائی گئی تو اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی اور لواحقین بھی خوش تھے انہوں نے بتایا کہ آج کوئی دورہ نہیں پڑا اور لڑکی تمام رات مزے سے سوئی رہی۔ میں نے پانچ ٹیکے پورے کئے اور روزانہ یہی بات دہراتا رہا کہ اب تمام عمر دورہ نہیں پڑے گا۔ چنانچہ پانچ دن لڑکی کو کوئی دورہ نہیں پڑا۔ پانچ دن کے بعد لڑکی قصور واپس چلی گئی اور میرے خیال میں یہ فائدہ صرف تحریک کی وجہ سے یعنی میری باتوں کی وجہ سے ہوا۔ اس میں ٹیکے کو کچھ دخل نہ تھا۔ ایک سال کے بعد وہ لوگ پھر آئے اور مجھے بتایا کہ لڑکی اب ٹھیک ہے کبھی دورہ نہیں پڑتا۔ اور اب وہ ایسی ہی ایک اور آسیب کی مریضہ میرے پاس لائے تھے۔

۵۔ ہمارے علاقے میں ایک تھانیدار ہا کرتے تھے تقریباً دو سال سے وہ مکان بدل کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ ایک دن ایک لڑکے کو ٹیکسی میں ڈال کر میرے پاس لائے۔ میں نے اسے ٹیکسی میں ہی بیٹھ کر دیکھا لڑکے کی عمر پندرہ سال تھی اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لڑکے نے چپ سادھ رکھی تھی اور کوئی حرکت نہیں کرتا تھا یعنی تقریباً بے ہوشی کی حالت تھی۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ یہ حالت تین ہفتے سے ہے وہ اسے اٹھا کر بڑی مشکل سے دودھ پلاتے تھے۔ اور وہ پھر نیم بے ہوشی کی حالت میں چلا جاتا تھا۔ لڑکا ان کا رشتہ دار تھا اور کسی گاؤں سے لایا گیا تھا۔ روائی دارو کے علاوہ سیانوں کے ٹوٹوں ٹوٹکوں سے بھی کافی علاج کیا گیا تھا۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا میں نے لڑکے کے پاس بیٹھ کر اونچی آواز سے کہا کہ یہ ایک اعصابی مرض ہے اور میں آج ایک ایسا ٹیکہ لگاتا ہوں جس سے بے ہوشی ٹوٹ جائے گی

اور کچھ گولیاں لکھ دیتا ہوں جس سے یہ پھر ٹھیک رہے گا اس ٹیکے سے دو دن میں لڑکا بالکل ٹھیک ہو جائے گا چنانچہ میں نے لارجکٹیل ۲۵ ملی گرام کا ٹیکہ لڑکے کے کولہے میں لگا دیا اور لبریم ۱۰ ملی گرام اور "نایامیڈ" کی گولیاں لکھ دیں۔ دو دن بعد لڑکا پھر میرے پاس لایا گیا لڑکا ہوش میں تھا اور میری باتوں کا بخوبی جواب دے رہا تھا لواحقین بڑے خوش نظر آتے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آج صبح سے ہی لڑکا ہوش میں ہے میں نے اونچی آواز سے پھر اپنا فقرہ دہرایا کہ اب یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔

ایسے بے شمار مریض آتے رہے اور ٹھیک ہوتے رہے ظاہر ہے کہ میں کوئی جادوگر ٹونہ کرنے والا یا جن قابو کرنے والا نہیں ہوں۔ اگر آسیب زدہ مریض میرے پاس آکر ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ تو یہ صرف "تحریک" کا کمال ہے اور تحریک صرف مرض ہسٹریا میں اثر کرتی ہے۔ ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام آسیب زدہ مریض فقط ہسٹریا کے مریض تھے۔

مرض ہسٹریا ایسے لوگوں کو ہوتا ہے جن کی شخصیت ذہنی طور پر کمزور اور پراگندہ ہوتی ہے۔ طبیعت میں وہم اور خوف کا عنصر زیادہ ہوتا ہے ان میں زیادہ تر مریض چھوٹی عمر کے ہوتے ہیں جن میں لڑکیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ میں نے کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ یا سائنس کے طالب علم کو اس مرض میں مبتلا نہیں دیکھا۔ یہ مرض دیہات میں اور کم تعلیم یافتہ، وہمی اور جاہل ماحول میں اکثر دیکھا جاتا ہے۔ توہمات، عورتوں میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ اس لئے یہ مرض بھی عورتوں میں زیادہ ہے۔ آسیبی مرض کی علامات پوری طرح مرض ہسٹریا کی علامات سے ملتی ہیں ایک اچھا معالج مضبوط ارادے اور مضبوط تحریک کے بل بوتے پر اس مرض کو ٹھیک کر سکتا ہے۔ یہ مرض عموماً ایک وہم کی صورت میں مریض کے لاشعور میں بیٹھ جاتا ہے اور مریض اپنے خیالات اور احساسات اور تصورات کی رہنمائی میں آسیب کا نام، صورت، نکتہ نظر اور کلام کو بیان کرنے لگتا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ جن یا بھوت نکالنے والے کو یا تماشائیوں کو نظر نہیں آتا۔ صرف مریض اسے دیکھتا ہے اور بیان کرتا ہے۔ اس بات کو عقل نہیں مانتی کہ ایک چیز جو مادی جسم نہیں رکھتی۔ وہ مریض کو نظر آنے لگے۔ اگر وہ چیز مادی جسم میں آکر مریض کو نظر آنے لگے تو اسے معالج اور تماشائی جو چاروں طرف کھڑے ہوں انہیں بھی نظر آنا چاہئے۔ دوسری عجیب بات یہ ہے کہ بھوت جب بھی بولتا ہے وہ مریض کی زبان استعمال کرتا ہے۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب مریض کے واہمہ اور خیالات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر معالج اپنے اُوپر بھروسہ کر کے مضبوط ارادے کے ساتھ "تحریک" سے کام لے کر مریض کا وہم دور کرنے کا جتن کرے تو عموماً سو فی صد کامیابی ہو سکتی ہے جیسے کہ میں اپنے مریضوں کا علاج کرتا ہوں، میں جن نکالنے والوں کا طریقہ استعمال نہیں کرتا صرف تحریک سے کام لیتا ہوں اور مریض کے لاشعور سے جن کا وہم دور کر دیتا ہوں اور جن نکالنے والے بھی تقریباً یہی طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی تحریک کے ذریعے دماغ سے وہم دور کرنا۔ ایک اور بات علاج کی کامیابی کے لئے ضروری ہوتی ہے وہ یہ کہ مریض اور اس کے لواحقین

یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آسیب کی بیماری سوائے مرض ہسٹریا کے اور کچھ نہیں!

کو معالج پر پورا بھروسہ ہو اور اس کی شخصیت سے مرعوب ہوں اس کے علاوہ معالج کو بھی اپنے اور اپنے علاج پر یقین اور بھروسہ ہونا چاہئے۔ ورنہ وہ مریض کو موثر طریقے پر تحریک دینے میں ناکام رہے گا۔ مندرجہ بالا بحث میں یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آسیب کی بیماری سوائے مرض ہسٹریا کے اور کچھ نہیں ہے اور میں نے اس مرض کے مریض صرف مضبوط تحریک سے ٹھیک کئے ہیں کوئی وظیفہ نہیں پڑھا۔ اور نہ ہی کوئی آیت تلاوت کی۔ اس بات سے ایک اور بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہسٹریا کا علاج کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے اس کے لئے تجربہ ہونا چاہئے اور اپنے اوپر بھروسہ ہونا چاہیئے

انتفاخ الرّیہ

اختلاج القلب

التہاب شعب الرّئن

تمباکو نوشی ایک بین الاقوامی المیہ

سگریٹ نوشی اور بیماریاں

معدہ اور گلے کی سوزش

خون کی نالیوں کی بیماریاں

رانا امان اللہ خاں

سگریٹ نوش کیا کہتے ہیں؟

سگریٹ پینا کسی زمانہ میں بہت بُرا خیال کیا جاتا تھا لوگ اس سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ مگر اب زمانہ تبدیل ہو گیا ہے۔ قدریں بدل گئی ہیں۔ انسانیت کا معیار بدل گیا ہے۔ انسان کے دل و دماغ تک تبدیل ہو گئے ہیں۔ مختلف باتوں کو جنھیں کل تک برائیاں تصور کیا جاتا تھا۔ آج انہیں کو انسان اپنی تہذیب عزت و وقار اور عظمت کی نشانیاں بنائے پھر رہا ہے۔ ان عادات میں سے سگریٹ نوشی بھی عصر جدید کی ایک مقبول ترین عادت ہے۔ جسے انتہائی مہذب خیال کیا جاتا ہے۔ جنیشن بن کر ایک ایک گھر میں داخل ہوئی۔ اور آج ایک زبردست اور مہلک خطرہ بن کر ابھری ہے۔ پوری دنیا میں اس کے خلاف ایک مہم شروع کر دی گئی ہے۔ "رائل کالج آف فزیشین" کی ایک رپورٹ کے مطابق برطانیہ جیسے ترقی پذیر ملک میں ہر سال تقریباً ۳۰۰۰۰ افراد سگریٹ نوشی کی وجہ سے موت کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ اور یہ چیز برطانوی طب کے لئے ایک چیلنج بن گئی ہے۔ مختلف ممالک میں ہونے والی تحقیق نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ جو لوگ سگریٹ نہیں پیتے ان کے مقابلے میں سگریٹ نوشوں کے وسط عمر مر جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ ہر پانچ سگریٹ پینے والوں میں سے دو کے ۷۰ سال کی عمر سے پہلے مر جانے کے امکانات ہیں۔

ان اعداد و شمار کو دیکھنے پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرے عزیز وطن میں نہ معلوم کتنے انسان اس لعنت کی وجہ سے موت کے شکنجے میں پھنس جاتے ہیں۔ کتنے ہی دوائیاں اور وقت پر علاج کی سہولتیں نہ ملنے کی بنا پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان کو جانِ آفریں کے حوالے کر دیتے ہیں کتنے ہی ہوں گے جو اس کے تباہ کن اثرات سے واقفیت نہ رکھنے کی بنا پر وقت سے پہلے موت کا شکار ہو جاتے ہوں گے۔

پچھلے دنوں میں نے ایک سروے کیا قوم کے مختلف طبقوں کے لوگوں سے اس سلسلے پر بات چیت کی۔ اور چند سوالات پوچھے میں نے تقریباً ۲۵ افراد سے ملاقات کی ان سگریٹ نوشوں میں سے تقریباً ۷۰ فیصدی نے بچپن میں دوستوں کی صحبت سے متاثر ہو کر سگریٹ نوشی شروع کی۔ ۲۵ فیصد نے ہوش سنبھالنے پر دوستوں کی محفلوں میں بیٹھ کر اپنے اوپر رنگ چڑھایا۔ اور صرف ۱۰ فیصد نے گھر والوں کی دیکھا دیکھی اس لعنت کو گلے لگایا۔ سبھی حضرات نے اس بات پر اتفاق کیا کہ سگریٹ پینے کے بہت سارے نقصانات ہیں۔ مگر صرف ۳۵ فیصد نے چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ ۷۵ فیصد نے اس کو محض اپنے ذہنی سکون، آرام۔ پریشانیوں سے فرار کے لئے نہ چھوڑنے کا بہانہ بنایا۔ ۱۰ فیصد نے لڑکیوں کو متاثر کرنے کے لئے سگریٹ پینے شروع کئے ۲۰ فیصد شوقیہ اور سوسائٹی و معاشرے کے رسم و رواج کا ساتھ دینے کے لئے سگریٹ نوشی کرتے ہیں۔

۵۰ فیصد اس عادت سے مطمئن ہیں۔ اور ۵۰ فیصد خلاف۔ مگر چھوڑنا وہ بھی نہیں چاہتے۔

حامد اقبال صاحب فائنل ایر۔ ایم۔ بی۔ بی ایس کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ ان سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ دوپہر کے کھانے کے بعد سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ ایسے ہی باتوں ہی میں میں نے حامد سے پوچھا آپ نے سگرٹ پینے کب شروع کئے؟ انہوں نے کہا۔ سگریٹ نوش دوستوں کی محبت نے رنگ دکھایا اور میں ایف۔ ایس سی میں اس بیماری کا شکار ہو گیا۔ نقصانات کے متعلق جانتے ہوئے بھی اس سے پیچھا چھڑانا ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ کیونکہ اب یہ ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں روز تقریباً ۳۰ سگریٹ پیتا ہوں۔ جب تک سگریٹ نہیں پی لیتا صبح حاجت نہیں ہوتی۔ کھانا صحیح طور پر ہضم نہیں ہوتا۔ اور پیٹ میں گیس سی بھری رہتی ہے۔ اور کبھی کسی معاملہ پر توجہ مرکوز کرنا ہوتی ہے تو میں سگریٹ کے بغیر اس کا بغور مطالعہ نہیں کر سکتا۔ سگریٹ پی لینے سے دماغ زیادہ کام کرتا ہے میں اس عادت سے مطمئن تو نہیں لیکن اسے چھوڑ دینا بھی میرے بس کا روگ نہیں۔

اس سلسلہ میں میں نے ایک جمعدار سے جو تقریباً ۶۰ سال کا لگتا تھا بات چیت کی۔ اس نے بتایا کہ میں نے سگریٹ پینا بچپن میں شروع کئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے والدین حقہ پیتے تھے۔ میں نے بھی دیکھا دیکھی حقہ پینا شروع کر دیا۔ اور پھر ہندوستان سے کراچی منتقل ہونے پر یہاں حقہ نہ ملنے کی وجہ سے سگریٹ شروع کر دیا۔ مجھے پتہ ہے اس عادت کے بہت سارے نقصان ہیں۔ اب یہ عادت اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اس کو چھوڑنا مشکل ہے۔ میرے خیال میں سگریٹ پینے کا مجھے بالکل کوئی فائدہ نہیں۔ میں اس عادت سے ہرگز مطمئن نہیں ہوں۔

سعید غنی بندر روڈ پر مشہور و معروف دوکان ہے۔ مجھے وہاں کے ایک کام کرنے والے محمد اکرام صاحب سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ میں نے ان سے پوچھ لیا کہ آپ سگریٹ پیتے ہیں ان کے ہاں کہنے پر میں نے باتوں ہی باتوں میں سوالات پوچھنا شروع کر دیئے۔ انہوں نے جواب دیا میں نے سگریٹ پینا ۱۵ سال کی عمر میں شروع کئے تھے اپنے دوستوں کے دیکھا دیکھی میں نے بھی سگریٹ پینا شروع کر دیئے۔ اس وقت تو معلوم نہ تھا اس کے نقصان ہیں لیکن اب پتہ ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے نقصانات ہیں آپ سگریٹ چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ اس پر انہوں نے کہا کہ میں وڈ بائن سگریٹ پیتا ہوں۔ اگر کسی وقت یہ سگرٹ نہ مل سکے اور مجھے کوئی دوسرا سگریٹ پینا پڑے تو مجھے سینہ میں جلن سی محسوس ہوتی ہے۔ جب میں سگریٹ بدل ہی نہیں سکتا تو چھوڑ دینا کیسے ممکن ہے۔

عبدالرحمن صاحب کراچی کے بڑے ٹھیکیدار ہیں۔ ان سے میں اس وقت ملا جب وہ مزدوروں کو کچھ ہدایات دے رہے تھے اور ساتھ ہی سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ سگریٹ پیتے ہوئے میں نے موقعہ غنیمت جانا اور ان سے کچھ سوالات پوچھے انہوں نے بتایا کہ مجھے آٹھ دس سال کی عمر میں سگریٹ پینے کی عادت پڑی۔ اپنے ماموں جان کے دیکھا دیکھی میں نے بھی سگریٹ پینا شروع کر دیا۔ مجھے نقصانات کا علم تو ہے مگر چند وجوہات کی بنا پر گلے پڑے ڈھول کو بجا رہا ہوں۔

جب کبھی اچھے آدمیوں کی سوسائٹی میں بیٹھے ہوئے کوئی آدمی سگریٹ پیش کرتا ہے اور سگریٹ نہ پیا جائے تو وہ آدمی اپنی بے عزتی سمجھتا ہے۔ دوسرا جب کبھی ہمارے ہاں انجینئر یا گورنمنٹ کے دوسرے آفیسر آتے ہیں تو میں ان کو سگریٹ پیش کرتا ہوں۔ اگر سگریٹ نہ پیش کیا جائے تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ کیسا AWKWARD آدمی ہے۔ وہ اس چیز کا برا مناتے ہیں۔ اگر میں خود سگریٹ نہ پیوں تو ان کو کیسے پیش کر سکوں گا۔ مجھے سگریٹ چھوڑ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑیگا میں اس عادت سے بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ صرف مجبوری ہے جس کی وجہ سے سگریٹ پیتا ہوں۔ فائدہ صرف اتنا ہے کہ فارغ بیٹھے ہوئے وقت گزر جاتا ہے۔

ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟

ڈاکٹر مظفر اقبال چغتائی

آپ نے یہ واقعہ تو سنا ہوگا کہ پہلی دفعہ انگلینڈ میں ایک نوکر نے اپنے صاحب کو تمباکو پیتے دیکھا تو اس نے جھٹ ان پر پانی کی بالٹی انڈیل دی۔ وہ بیچارہ سمجھا کہ شاید صاحب کو آگ لگ گئی ہے لیکن حضرت انسان بھی عجیب جانور ہیں کہ جس چیز سے وہ اس قدر بیگانہ تھے، وہی چیز اب ان کے لئے باعثِ تسکین ہے۔ جدید سائنسی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ تمباکو واقعی ہماری نسلوں میں بے قابو آگ سے بھی زیادہ نقصان کر رہا ہے۔ لیکن اس آگ کو بجھانے میں ترقی یافتہ ممالک بھی ہر کوشش کے باوجود ناکام نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ یورپ میں اب تو سگریٹ کی اشتہار بازی پر بھی قانونی پابندی لگا دی گئی ہے اس کے علاوہ مختلف احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ لیکن

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کے مصداق تمباکو نوشی فیشن ہی بنتا جا رہا ہے۔

رائل کالج آف فزیشنز نے ایک رپورٹ حال ہی میں شائع کی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال ہزاروں اموات سگریٹ نوشی کے مختلف عوارض کی بنا پر ہوتی ہیں۔ ان عوارضات میں مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) ہونٹ، زبان، معدہ اور پھیپھڑوں کا سرطان

(۲) اعضائے تنفس کی بیماریاں مثلاً

حنجرہ اور گلے کی سوزش اور سرطان

انتفاخ الرئہ EMPHYSEMA

CHRONIC BRONCHITIS التہاب شعب المزمن

ANGINA PECTORIS دل کی بیماریاں مثلاً ذبح القلب

PALPITATION خفقان یا ہول دل

TACHYCARDIA اختلاج القلب

TOBACCO AMBLYOPIA آنکھ کی مختلف بیماریاں خصوصاً

BURGER'S DISEASE خون کی نالیوں کی بیماریاں مثلاً

تمباکو کے استعمال کے مختلف طریقوں میں تمباکو نوشی، تمباکو کی نسوار لینا، پان کے ساتھ تمباکو چبانا وغیرہ شامل ہیں۔ تمباکو نوشی میں سگریٹ۔ سگار۔ پائپ۔ حقہ، بیڑی وغیرہ مستعمل ہیں۔ تمباکو خواہ کسی طریقہ سے استعمال کیا جائے، اس کے نقصانات مسلم ہیں۔

ہمارے معاشرہ میں تمباکو کے استعمال کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ طلباء، کسان، مزدور، کلرک حضرات، اساتذہ وغیرہ سبھی اس خبیث عادت میں مبتلا ہیں۔ قوم کے مسیحا جنہیں صحت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے یعنی ڈاکٹر اور حکیم صاحبان بھی اس سے نہیں بچے۔ بلکہ اسے تمباکو کی خوش قسمتی سمجھئے کہ اسے حضرات علمائے کرام کی بھی سرپرستی حاصل ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اسے

پاکستانیوں کی صحت کے دشمن

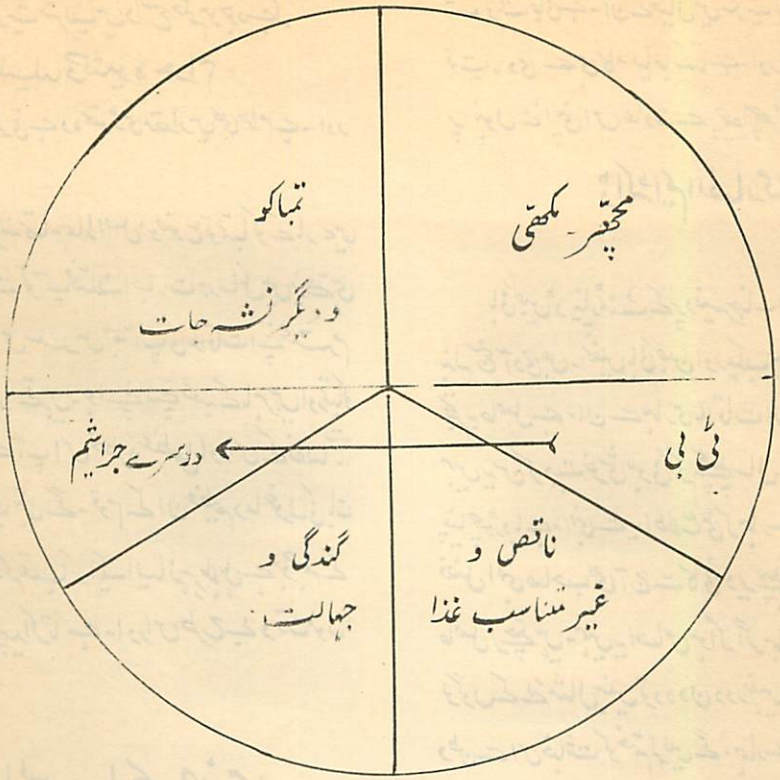

(۱) سگریٹ کی اشتہار بازی پر مکمل پابندی عائد کردی جائے۔

(۲) ہر سگریٹ کی ڈبیہ پر لفظ "زہر" لکھا جائے۔

(۳) ہر ڈبیہ پر نکوٹین کی مقدار درج کی جائے۔

(۴) ریڈیو، ٹیلیویژن، فلم، پریس غرضیکہ ہر ممکن طریقہ سے تمباکو نوشی کے خلاف پروپیگنڈا کیا جائے۔

(۵) سگریٹ چھوڑنے والوں کے لئے خاص کلینک بنائے جائیں۔

سگریٹ پیکٹوں میں ایسے کارڈ رکھے جائیں جن پر یہ ہدایات درج ہوں کہ

- کم سے کم سگریٹ پینے چاہئیں۔
- کم سے کم کش لگائیں۔
- سرے تک پورا سگریٹ نہ پئیں
- فلٹر والا سگریٹ پینا بہتر ہے۔
- کم سے کم نکوٹین اور ٹار والے سگریٹ پینے چاہئیں۔
- دھوئیں کو اندر مت کھینچیں۔

شراب سے زیادہ نشہ آور اور زہریلا ہوتے ہوئے بھی مکروہ قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ حدیث شریف میں واضح حکم موجود ہے کہ

"ما اسکر قلیلہ وکثیرہ حرام"

ترجمہ: جو چیز نشہ پیدا کرتی ہے وہ تھوڑی مقدار میں بھی حرام ہے۔ اور زیادہ میں بھی۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ہمارا اصل موضوع تو تمباکو کے بارے میں ہے۔ اس کے نقصانات تو آپ مختلف اخبارات و رسائل میں پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ آیئے آج اس سلسلہ میں ہم آپ کی ملاقات اپنے محترم اساتذہ صاحبان سے کراتے ہیں۔ جو اپنے اپنے شعبہ کے ماہر ہیں اور تمباکو پر ان کی رائے زنی سے آپ اس خطرۂ عظمیٰ اور اس کے نقصانات سے واقف ہو جائیں گے۔ قوم کے ان عظیم دماغوں کی بات چیت سے پتہ چلتا ہے کہ تمباکو ایک ایسا زہر ہلاہل ہے جو جسم کے ہر حصہ پر اثرات پیدا کرتا ہے۔ اور اس طرح بے وقت موت کا سبب بنتا ہے۔

سرجن۔ ایس۔ ایچ رضوی

سب سے پہلے ہماری ملاقات جناب رضوی صاحب سے ہوئی جو کہ آج سے کچھ مدت پہلے سگار کے بہت حد تک شائق تھے۔ بلکہ انھیں تو ہم لوگ CHAIN SMOKERS کی صف میں شمار کرتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ تمباکو کے رسیا ہونے کی بنا پر وہ اس کے فوائد پر خوب روشنی ڈالیں گے۔ لیکن ہمارے استفسار پر وہ چھوٹتے ہی بولے۔ "بھئی! اس کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان کا سودا ہے اسی لئے تو میں نے اسے بالکل چھوڑ دیا ہے۔"

اس سے ہمیں بے حد خوشی ہوئی کہ جناب رضوی صاحب نے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ چھوڑنے کی وجہ یہ بتائی کہ کثرت تمباکو نوشی سے ان کے ہاتھوں اور پاؤں کی شریانیں SPASM سکڑنا PERIPHERAL BLOOD VESSELS شروع ہو گئی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ BERGERS کی بیماری GANGRENE میں BURGER'S DISEASE سگریٹ نوشی سے تک نوبت آجاتی ہے۔ ان کے خیال میں سگریٹ نوشی ترک کرنے کے لئے صرف قوت ارادی سے ہی کام لیا جا سکتا ہے۔ اور اسی قوت کے بل بوتے پر انہوں نے اپنی اس عادت سے پیچھا چھڑایا ہے

ڈاکٹر ایم انصاری

بائی جین ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر جناب انصاری صاحب بہت بذلہ سنج آدمی ہیں۔ انھیں بائی جین اور پبلک ہیلتھ کے میدان میں وسیع تجربہ حاصل ہے۔ ان سے ہماری ملاقات ان کے دفتر میں ہوئی۔ ہمیں یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ پچھلے سال سے انہوں نے بھی تمباکو پینا چھوڑ دیا ہے۔ انہی سے یہ اطلاع ملی کہ ہمارے استاد جناب سرجن فضل الٰہی صاحب بھی آج سے کافی دیر پہلے اس عادتِ بد سے چھٹکارا حاصل کر چکے ہیں۔ ہمیں یہ احساس ہوا کہ اگر ہمارے اساتذہ کرام ہم لوگوں کے لئے مثال بنیں تو وہ دن دور نہیں جب ہم اپنے پیارے وطن سے اس خباثت کو ختم کر لیں گے۔ ہمارے مختلف سوالوں کے جواب میں انہوں نے تمباکو کے مختلف نقصانات گنوائے۔ انہوں نے فرمایا کہ سگریٹ چھوڑنے کے لئے صرف اور صرف قوت ارادی ہی کام آسکتی ہے۔ ان کے خیال میں ایک دن میں پانچ سگریٹ پینے والے کو بھی کینسر کا خطرہ اور پچاس سگریٹ پینے والے کو بھی۔ اس لئے بتدریج سگریٹ نوشی چھوڑنے کی بجائے ایک دم چھوڑنی چاہئے اور لوگوں کو اس لعنت سے بچانے کے لئے صحت کی تعلیم HEALTH EDUCATION عام ہونی چاہئے اور اس کام کے لئے ابلاغ عامہ کے مختلف ذرائع مثلاً ریڈیو، فلمیں، ٹیلیویژن۔ اخبارات اور بڑے بڑے پوسٹر کام میں لانے چاہئیں

ڈاکٹر سالار اختر عزیز

اس کے بعد گائنا کالوجی وارڈ میں محترم سالار صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے سوال کیا۔

"سر! کیا تمباکو نوشی سے حاملہ عورتوں پر کوئی اثر پڑتا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا کہ دوسرے نقصانات کے علاوہ تمباکو نوش عورتوں کے ہاں بچہ کم وزن کا پیدا ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر زبیدہ صاحبہ

اس سوال کے جواب میں گائناکالوجسٹ محترمہ ڈاکٹر زبیدہ صاحبہ نے فرمایا کہ چونکہ نکوٹین خون کی نالیوں کو سکیڑتی ہے۔ اس لئے ماں کے پیٹ میں بچہ کو خون پہنچانے والی نالیاں (SPIRAL VESSELS) بھی سکڑتی ہے اور کم خون پہنچتا ہے۔ اس سے اسقاط یا قبل از وقت ولادت PREMATURE DELIVERY ہو جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ علاوہ بریں تمباکو نوشی سے ماہواری پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔ عورتوں اور مردوں کی قوتِ پیدائش پر تمباکو کے اثر کے بارے میں سوال کرنے پر انہوں نے فرمایا کہ اس پر ابھی کوئی تحقیق نہیں کی گئی۔ میڈم زبیدہ کے خیال میں دودھ پلانے والی ماؤں (LACTATING MOTHERS) کی سگریٹ نوشی سے تمباکو کے زہریلے اثرات بچے تک پہنچ سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنا یہ کارنامہ بڑے فخر کے ساتھ بتایا کہ ڈاکٹر بننے کے فوراً بعد انہوں نے اپنے والد صاحب کی سگریٹ نوشی چھڑا دی۔

امید ہے ہم بھی یہ ہتھیار اپنے اعزا و اقربا پر استعمال کریں گے اور اس نعمتِ غیر مترقبہ سے ان کو نجات دلوائیں گے۔

ڈاکٹر محمد عمر خان پولیس سرجن

ڈاکٹر عمر صاحب باوجود پولیس سے منسلک ہونے کے بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدات OBSERVATIONS پر مبنی ہے۔ ان سے ہماری گفتگو یوں ہوئی۔

سوال نمبر ۱: کیا آپ نے پوسٹ مارٹم کرتے وقت تمباکو نوش لوگوں کے جسم میں کوئی خاص تبدیلی نوٹ کی ہے؟

جواب: ہاں! SMOKERS کے پھیپھڑے دوسروں کی نسبت کالے ہوتے ہیں۔ اور بڑی عمر کے لوگوں میں انتفاخ الریہ (EMPHYSEMA) کی علامات پائی جاتی ہیں۔ البتہ حقہ پینے والوں میں یہ علامات کم ہوتی ہیں۔

سوال نمبر ۲: کیا آپ نے تمباکو کی وجہ سے واقع کوئی موت دیکھی ہے؟

جواب: آدھا اونس یا تین چار قطرات نکوٹین سے موت واقع ہو سکتی ہے۔ لیکن کوئی ایسا کیس میرے پاس نہیں آیا۔

جناب عمر صاحب نے تمباکو کے دو دلچسپ فوائد بھی بتلائے۔ پہلا یہ کہ جس نالی میں حقہ کا پانی گرایا جائے وہاں سانپ نہیں رخ کرتا کیونکہ شاید اسے بھی نکوٹین کی خوشبو سے ڈر لگتا ہے۔ دوسرا یہ کہ گلاب کے پودوں پر ایک خاص قسم کے FUNGUS کو دور کرنے میں بھی حقہ کا پانی فائدہ مند ہے۔

پروفیسر عبدالرحیم پراچہ

اس کے بعد ہم شعبۂ امراض قلب کی طرف چلے۔ اس شعبہ کی طرف بڑھتے ہوئے ہمیں اس عظیم ہستی یعنی مرحوم پراچہ صاحب کی یاد آ گئی۔

مرحوم پراچہ صاحب کا وہ فقرہ قابلِ غور ہے جو انہوں نے درجِ القلب (Angina pectoris) پر لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ "دل کی بیماریوں میں شراب پی لینا، سگریٹ پینے سے بہتر ہے۔"

اسی سے تمباکو کے نقصانات کا اندازہ کر لیجیے!

وہ عظیم انسان ہم سے بچھڑ گیا۔ لیکن ان کی باتیں یاد رہیں گی۔

پروفیسر محمد شریف چودھری

محترم شریف صاحب نے دل پر تمباکو کے اثرات کے بارے میں فرمایا کہ "قلب کے معاملے میں تمباکو چاہے سگریٹ کی شکل میں ہو، پان میں ہو یا نسوار کی صورت ہو، دو دھاری تلوار کی مانند ہے۔ تمباکو میں موجود کیمیائی جزو

(نکوٹین) دل کو غذا پہنچانے والی شریانوں (Coronary arteries) کو سکیڑتا ہے اور بیک وقت دل کی رفتار کو بھی بڑھاتا ہے۔ اس طرح بڑھی ہوئی رفتار کے وقت دل کی غذائیت بڑھنے کی بجائے کم ہو جاتی ہے اور دل کے درد (Angina pectoris) نمودار ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ بعض قلب نکوٹین کے اثر سے بہت جلدی متاثر ہوتے ہیں اور اس چیز کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔ مثلاً چلتے چلتے دل کی رفتار میں بے قاعدگی ہونا Ectopic BEATS) دیگر دل کی رفتار کا بہت تیز ہو جانا Paroxysmal Tachycardia) چنانچہ طبی لحاظ سے تمباکو کا استعمال سخت نقصان دہ ہے اور قلب کی صحت کے منافی ہے۔

پروفیسر ایم حسین صاحب

اس کے بعد آنکھوں کے ماہر جناب ڈاکٹر حسین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ ایک خاص قسم کے تمباکو SHAG پینے سے اندھاپن (TOBACCO AMBLYOPIA) (TOBACCO ہو سکتا ہے۔ تمباکو پینے سے پردہ شکیبہ (RETINA) کی شریانیں سکڑ کر ISCHEMIA پیدا کر دیتی ہیں۔

ڈاکٹر جعفری صاحب

ناک کان گلے کے ماہر جناب جعفری صاحب کے بیان کے مطابق تمباکو کے استعمال سے ناک، کان اور گلے کی کافی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں مثلاً حنجرہ اور گلے کی سوزش، ناک کی سوزش

ڈاکٹر فخر حسین صاحب

ماہر امراضِ دندان ڈاکٹر فخر حسین صاحب کے مشاہدہ کے مطابق تمباکو نوشی اور تمباکو چبانا دانتوں کے لئے سخت نقصان دہ ہیں۔ اس سے دانت گھس جاتے ہیں اور ان پر مختلف داغ دھبے (STAINING) پڑ جاتے ہیں جس سے پائیوریا ہونے کا اندیشہ ہے۔

چیسٹ سرجری کے ڈاکٹر شیرازی صاحب بھی بہت خوش طبع آدمی ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق پٹرول اور دوسری چیزوں کی بجائے تمباکو پر دگنا تگنا ٹیکس لگنا چاہیے۔ شاید اس لئے کہ وہ خود اس ٹیکس سے بچ جائیں گے کیونکہ وہ سگریٹ نہیں پیتے۔ انہوں نے بھی منہ اور سینہ کے مختلف امراض کی بڑھتی ہوئی رفتار کی وجہ تمباکو نوشی کو قرار دیا۔

ڈاکٹر اقبال یار صاحب

مرکزِ انسدادِ تپِ دق کے ڈائرکٹر ڈاکٹر اقبال یاد جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ انہوں نے بعض نہایت دلچسپ حقائق بتلائے۔ مثلاً تمباکو کے اندر پایا جانے والا CARCINOGENIC مادہ (TARS) چوہوں پر ملنے پر انہیں کینسر کا عارضہ لاحق ہو گیا۔

ڈاکٹر اختر صاحب

شعبۂ امراضِ دماغ و نفسیات کے ڈاکٹر اختر صاحب نے سگریٹ نوشی کے نفسیاتی تجزیہ کے بارے میں بتایا۔ فرائڈ کے نظریہ کے مطابق یہ عادت ORAL SEX کے اظہار کا ایک طریقہ ہے

پروفیسر مشتاق احمد

شعبۂ طب سے منسلک ہمارے معزز استاد جناب ڈاکٹر مشتاق صاحب نے تمباکو کے مختلف عوارض کا ذکر کیا مثلاً

بھوک نہ لگنا قروحِ معدہ تیزابیتِ معدہ سعال مزمن

انہوں نے ہمارے علم میں اضافہ کرتے ہوئے یہ دلچسپ واقعہ سنایا کہ ان کے پیش رو جناب ڈاکٹر میجر حسن صاحب سگریٹ کے دھوئیں سے سخت حساس (ALLERGIC) تھے۔ سگریٹ کا دھواں آتے ہی ان کی ناک بند ہو جاتی اور چھینکیں آنا شروع ہو جاتیں

زندگی رقص کناں

جب کسی ندی کے کنارے کوئی گڈریا گدگدی کرتی ہوئی سرسراہٹ میں بانسری پر کوئی مدھر گیت الاپ رہا ہو۔

جب تنہائیاں محفلیں بن جائیں

جب تنہائیوں میں کسی کی یاد اداسیوں پر غلبہ پالے۔

جب کلیاں چٹک چٹک کر پھول بننے لگیں

جب ہر طرف پھول ہی پھول بکھر جائیں

جب بچپن گزر جائے اور جوانی آجائے

جب کونپلیں پھوٹنے لگیں اور ہوا مشکبار ہو جائے

جب دل کھل جائے اور ابر مچل جائے

جب گھٹا چھائے اور مینہ آجائے

اور

جب کسی حسینہ کو اپنے محبوب کی یاد شدت سے ستانے لگے

تو

سینے میں سانس بھی چبھنے لگتا ہے۔

تب زندگی رقص کناں ہوتی ہے

مدیر اعلیٰ

بوئے گل

ایک پھول، پھولوں کے جھرمٹ میں تھا
اور ساتھ اس پھول کے ایک ادھ کھلی کلی تھی
کر رہے تھے دونوں کچھ سرگوشیاں
کلی نے کہا پھول، تیرے حسن کے کیا جلوے ہیں
تیری خوشبو کتنی بھینی بھینی ہے۔
جیسے مہک ہو کسی سہاگن کے تن بدن کی
تیرے رنگ میں کس قدر شوخی ہے۔
جیسے سرخی ہو کسی شہید کے تازہ لہو کی
اور تجھ پر یہ شبنم کے قطرے۔ کیا کہہ رہے ہیں
جیسے صدا دے رہے ہوں کسی بے کس کے آنسو
اور خنک بساند جو آ رہی ہے تجھ میں سے
جو آتی ہے کبھی کبھی کسی مزدور کے پسینے سے جب مزدوری نہ ملے۔
اور تیرے یہ قہقہے دبے دبے کیوں ہیں۔
جن میں کھنک ہے کسی مزدور دوشیزہ کی چوڑیوں کے بجنے کی۔
پھول نے کہا "ذرا کان اِدھر لاؤ"
میں پھول ہوں کل کا!
آج میری موت کا دن ہے اور تیرے پھول بننے کا
صبح تو ہو لینے دو۔
ذرا کھل جاؤ تو میں پوچھوں گا
یہ خوشبو تجھے چاہیئے، یہ سرخی تیرے کس کام کی ہے، یہ بساند تجھے کس قدر عزیز ہے۔
کلی ڈر گئی اور پھول مرجھا گیا

(مدثر اعلیٰ)

غلام ثقلین نقوی
رضیہ بٹ
ڈاکٹر ظفر اقبال چغتائی
فرخندہ لودھی
صداقت علی چودھری

دی هیرو

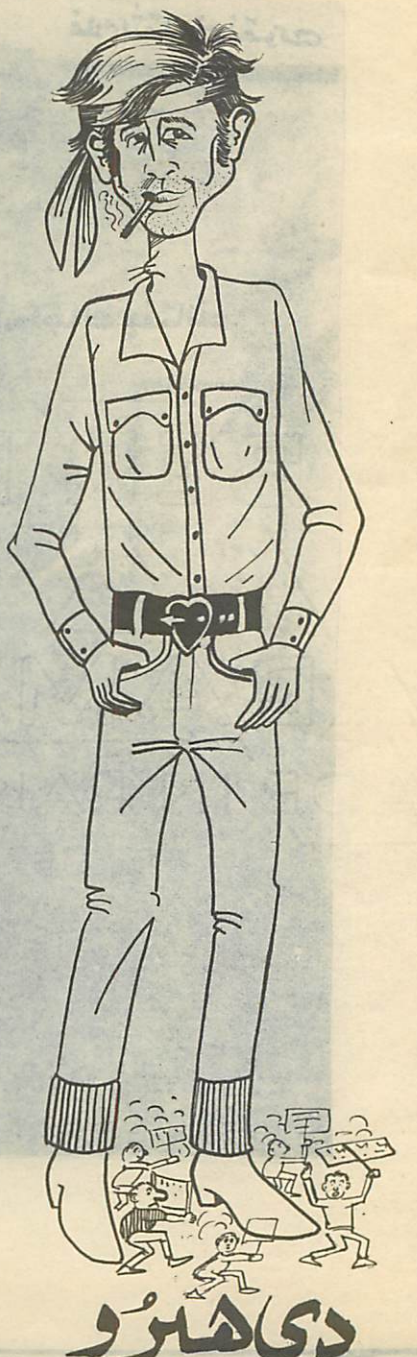

غلام الثقلین نقوی

اس کی شخصیت میں کوئی ایسی نمایاں بات نہ تھی کہ انسانوں
کے کسی بڑے ہجوم سے میری توجہ اسے خاص طور پر منتخب کر لیتی
میلی سی تنگ پتلون اور بدرنگ پرانی سی بش شرٹ میں ملبوس
ایسے نوجوان اگر سینکڑوں کی تعداد میں نہیں تو بیسیوں کی تعداد میں
آپ کو روزانہ لاہور کی سڑکوں پر مل جائیں گے لیکن مقبرۂ جہانگیر
کی ایک روش پر میں نے اسے دو غیر ملکی ہپیوں (لڑکے اور لڑکی)
کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا تو اس کی شخصیت کا ایک دھندلا
سا نقش میرے ذہن میں قائم ہو گیا۔ وہ ایک لمبے قد کا اور دبلے
پتلے جسم کا لڑکا تھا۔ میں اس کے جسم کو چھریرا ابھی نہیں کہہ سکتا
کیونکہ چھریرے جسم میں ایک تناسب ہوتا ہے اور یہ تناسب اس
کے جسم میں مفقود تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم میں
پیچ لگے ہوں اور اتنے ڈھیلے کہ ایک عضو دوسرے عضو سے

کیفیت تھی کہ پنکھیا اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ میں شیڈ سے باہر نکل آیا۔ اتنے میں بس آ گئی میں اس میں سوار ہو گیا۔ تب مجھے اس پر اور اس غیر ملکی لڑکی پر غصہ آیا۔ نئی نسل جذبات سے کس قدر عاری ہو گئی ہے۔ اس نے میرا شکریہ ادا کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی۔ اس لڑکے نے میرے روپے میں سے بچے ہوئے آٹھ آنے بھی مجھے واپس نہیں کیے تھے۔

"احمق"، میں نے زیر لب کہا۔

اور سوچنے لگا کہ احمق کون تھا؟ میں یا وہ؟

اور مجھے ہنسی آ گئی۔

اس "نا" میں زندگی کے ڈرامے کا نقطۂ عروج پوشیدہ تھا۔ وہ ڈرامہ جو بیک وقت ایک المیہ بھی تھا اور فارس (FARCE) بھی۔ ایک "نا" نے ایک شخص کی شولڈری اور دوسرے کی تمنائے تشکر کو کتنے مضحکہ خیز اور المناک انداز میں رد کر دیا تھا اس ایک "نا" پر روایات کا محل دھڑام سے گر پڑا تھا۔ اقتدار کے دیوتا اپنی اصل بنیادوں میں کس قدر بودے اور سطحی تھے کہ ایک کلمۂ نفی کی ضرب سے پاش پاش ہو کر رہ گئے تھے

بس کے اندر کی بے ہوش کر دینے والی گرمی، بھاپ اور اس نے مجھے بے حال کر دیا تھا۔ اس پر اضافہ یہ کہ مجھے سیٹ بھی نہ مل سکی۔ بار کے ساتھ لٹکے لٹکے میری سوچ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ سوچ بھی ایک ذہنی عشرت ہے۔ اس کے لئے ایئر کنڈیشنڈ، کمروں، صوفوں اور قالینوں کی ضرورت ہے شاید۔ عرق عرق جسموں کی محنت اور پسینے میں بسی ہوئی باس نے میرے حواس مختل کر دیئے تھے۔ بس سے باہر آنکھوں کو چندھیا دینے والی دھوپ تھی، مکان دھوپ میں جل رہے تھے تارکول کی سڑک لو میں جھلس رہی تھی تب مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پہاڑ کی تلہٹی میں ایک جٹا دھاری بوڑھے برگد کی چھاؤں میں سمادھی لگائے بیٹھا ہوں اور میرے قدموں میں ایک صاف شفاف چشمہ پھوٹ رہا ہے اور اس کا پانی یخ ٹھنڈا ہے۔ ہوا میں خنکی ہو اور میں نے جیسے سنیاس آشرم لے لیا ہو۔ میں نے محنت، پسینے، گرمی، سردی، لو، دھوپ، مشینوں کے شور، جھوٹ، فریب، ظلم اور استحصال کے خلاف بغاوت میں دنیا ہی کو تیاگ دیا تھا اور اب نروان کی منزل قریب تھی کہ ایک جھٹکا سا لگا۔ بس کھڑی ہو گئی۔ میں نے جھک کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ میرا بس اسٹاپ آ گیا تھا۔ یہ ہپی لوگ لاہور، کراچی اور راولپنڈی میں کیوں آتے ہیں۔ انھیں شہروں کی ہاؤ ہو میں کیا ملتا ہے بھلا؟ نروان تو برگد کی گھنی چھاؤں کے نیچے ملتا ہے... میں نے بس سے اتر کر سوچا۔

تب میں اسے بھول گیا۔

بھول جانے کا لفظ بھی میں نے غلط استعمال کیا ہے۔ اس چیز کو بھول جانے یا یاد رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس سے نہ دلی لگاؤ پیدا ہوا ہو نہ کبھی نفرت محسوس ہوئی ہو تاہم ایک شام مال کے فٹ پاتھ پر میری اس سے اچانک ملاقات ہو گئی، تو میں چونک گیا کیونکہ آج وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ وہ ہپی لڑکی تھی جسے میں نے بس اسٹیڈ پر نیم بے ہوش پایا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے، آنکھیں جھکائے ہوئے وہ میرے پاس سے گزرے تو میں ایک دو لمحوں کے لئے ٹھٹک گیا۔ اس نے قلمیں بڑھا لی تھیں۔ کانوں پر سیاہ بالوں کے گچھے تھے۔ اس کی ٹھوڑی منڈی ہوئی تھی۔ اس کے پسینے میں بھیگے ہوئے میلے کپڑوں سے بدبو کے بھبکے آ رہے تھے۔ اس کی ساتھی لڑکی کا چہرہ دھوپ اور لو میں جل کر تانبے کی طرح سرخ ہو چکا تھا لیکن سرخی میں دمک نہیں تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں کی کیفیت کو بیان کرنے کے لئے لفظ نہیں مل رہے۔ یہ آنکھیں یقیناً خوبصورت تھیں، لیکن اب لمبی لمبی نیم سنہری پلکوں کے پیچھے نیلگوں چمک کند ہو چکی تھی۔ یہ آنکھیں کسی کو نہیں دیکھ رہی تھیں۔

وہ اس کے پہلو بہ پہلو یوں چل رہی تھی، جیسے اس کے ساتھ نہ ہوں بلکہ وہ فٹ پاتھ پر اتفاقاً اکٹھے ہو گئے ہوں گے۔

"پاکستانی ہپی!" ایک آواز میرے پیچھے سے آئی۔

دو نوجوان میرے پاس سے گزر کر میرے آگے آگے ہو لئے۔

میں نے بھی رفتار تیز کر لی۔

"لڑکی پاکستانی نہیں ہے۔" اسی آواز نے کہا۔

"ہاں... نہیں ہے...... سالے نے پتہ نہیں کہاں سے اڑا لی؟" دوسرا نوجوان بولا۔

"اچھا ہاتھ مارا ہے۔ بڑی گرم معلوم ہوتی ہے۔"

"گرم!" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

انھوں نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور ذرا سا جھینپ گئے۔ وہ رک گئے۔

میں نے مسکرا کر کہا "مجھے تو کوئی ہپی گرم معلوم نہیں ہوتا..... میرا مطلب ہے جنسی طور پر۔"

"جی نہیں..... میرا مطلب تھا..... یہ لوگ کچھ عجیب سے ہوتے ہیں..... ان کے نزدیک اخلاقی اقدار کوئی معنی نہیں رکھتیں یہ جنس کو بھی ایک بائیولاجیکل نیڈ..... میرا مطلب ہے ایک جسمانی ضرورت کا درجہ دیتے ہیں۔" اس نے فلسفہ بگھارا۔

"جنس بھی صحت مند زندگی کا ایک نہایت اہم پہلو ہے۔" میں نے بھی فلسفہ آرائی کی۔

"یقیناً" اس نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ ہپی جہاں تک میرا خیال ہے اس پہلو کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے۔" میں نے کہا۔

"آپ نہیں جانتے....."

واقعی میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں تو انہیں سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر دیکھتا ہوں۔ مجھے اتنے سطحی مشاہدے کے بعد یہ نتیجہ نکالنے کا حق نہیں تھا تاہم ان کی شکل و صورت سے....."

"جی نہیں" اس نے ہنس کر کہا "شکل صورت سے ہمیشہ دھوکا لگتا ہے۔ وہ انگریزی میں ہے نا؟....."

"انگریزی کو چھوڑو یار! میں نے تمہیں پچھلے اتوار کا واقعہ نہیں سنایا تھا۔" دوسرے نوجوان نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو....."

"میں نے انھیں ایک سستے سے ہوٹل میں دیکھا۔ ایک ہپی لڑکے اور دو ہپی لڑکیوں کو۔ تینوں غیر ملکی تھے۔ وہ چائے پی رہے تھے۔ میں ان کے سامنے کی میز پر بیٹھ گیا۔ مدت سے خواہش تھی کہ کسی ہپی سے ملاقات ہو تو کچھ باتیں پوچھوں۔ اچھا موقع ملا تو میں نے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں کے رہنے والے ہیں۔ اس نے ٹوٹی ہوئی انگریزی میں بتایا کہ سویڈ ہیں۔ وہ ترکی، عراق، ایران اور افغانستان سے ہوتے ہوئے پاکستان آئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ اتنے لمبے سفر کے لئے ان کے پاس روپیہ کہاں سے آیا وہ چپ رہا۔ میرے اصرار پر اس نے بتایا کہ اس کے پاس دو چیک بکیں ہیں۔ دو چیک بکیں! میں نے حیران ہو کر کہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا تاہم اس نے مسکرا کر باری باری اپنی ساتھی لڑکیوں کو دیکھا اور میں سمجھ گیا۔"

"کیا سمجھے! میں تو خاک بھی نہیں سمجھا" دوسرے نوجوان نے کہا۔

"بڑی موٹی عقل کے آدمی ہو۔ وہ لڑکیاں..... میرا مطلب ہے..... اس کا مطلب تھا..... یار! وہی تو اس کی چیک بکیں تھیں۔"

دوسرے نوجوان نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "ایک چیک تو میں بھی لکھنے کو تیار ہوں۔ پھر مل جائیں تو طے کر لینا۔"

میں نے سوچا "میرے پاکستانی ہپی نے بھی چیک بک تلاش کر لی ہے کیا؟"

لیکن یہ خیال فضول تھا۔ ہپی جنس زدہ نہیں ہیں۔ نہ وہ جنس بیچتے ہیں۔ وہ بھکاری ضرور ہیں۔ بیوپاری نہیں ہیں، میں نے کسی ہپی کو اپنے پاس سے گزرتی ہوئی لڑکی کو آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا اور ہپی لڑکیوں کے سپاٹ چہروں، کند آنکھوں اور پتھریلے جسموں میں تو مجھے کبھی جنسی کشش محسوس نہیں ہوئی تھی یا شاید جب جنس صرف ایک جسمانی ضرورت بن جائے تو اس کی الوکھی کشش جاتی رہتی ہے یا وہ پراسرار کشش جو ایسی وادیوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے جہاں طلسمات کی سی فضا ہے، جسم سے الگ کوئی وجود رکھتی ہے یا روحانی فرار سے جسم اپنی جاذبیت کھو دیتا ہے۔ میں اس کا فیصلہ نہ کر سکا یہ بہت پیچیدہ نفسیاتی مسئلہ ہے۔

تب ایک دن بس اسٹاپ پر وہ پھر نظر آ گیا۔

آج وہ پھر شولری، اور خالص مشرقی شولری کے موڈ میں تھا۔ وہ بس سے اترتے چڑھتے ہوئے لڑکوں کا بڑی سختی سے محاسبہ کر رہا تھا۔ وہ اس دروازے کا پاسبان بنا کھڑا تھا جہاں سے عورتیں

مناسب طور پر چسپاں بھی نہ ہو سکا ہو۔ اس کے گھنے، گندے اور الجھے بالوں میں اس کا چہرہ مضحکہ خیز حد تک بے معنی بن کر رہ گیا تھا۔ اس نے ماتھے پر ایک بد رنگ پھیکے سرخ رنگ کی پٹی باندھ رکھی تھی۔

غیر ملکی ہپی شاید انگریزی نہیں جانتے تھے کیونکہ تینوں پہلو بہ پہلو چل رہے تھے اور کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ مرد ہپی کی سرخ داڑھی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ اور اس کی ساتھی لڑکی اتنی ننھی منی اور گڑیا سی تھی کہ اگر وہ منی اسکرٹ پہنے ہوئے مجھے مال روڈ یا انار کلی میں نظر آ جاتی تو مجھے اس کے ناپختہ جسم پر دوسری نظر ڈالتے ہوئے یقیناً جھجک محسوس ہوتی لیکن اب وہ ڈھیلے ڈھالے میلے سے، جو دھیوری لباس میں جو شاید اس نے کسی پاکستانی لڑکی سے مانگ کر لیا تھا، اتنی معصوم لگ رہی تھی کہ میرا جی اسے بار بار دیکھنے کو چاہ رہا تھا۔ اس لڑکی کی معیت میں پاکستانی ہپی کو دیکھ کر مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ وہ غیر ملکی ہپی بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے میں کچھ بے چینی سی محسوس کر رہے تھے۔ وہ مقبرے کے اندر گئے، انہوں نے مقبرے کے گرد ایک چکر لگایا میناروں کی طرف گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتے رہے اور پھر چھاؤں میں گھاس پر آ کر بیٹھ گئے۔ پاکستانی ہپی نے چنے کی بھنی ہوئی دال سے ان کی تواضع کی۔ اس نے دال کی تکونی پڑیا خریدنے کے لئے ہپ پاکٹ سے روپے کا جو تڑا مڑا اگندہ سا نوٹ نکالا تھا، وہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

میں جس بس اسٹاپ پر بس سے اترتا چڑھتا تھا، وہاں میں نے اکثر اس لڑکے کو دیکھا ہوگا، کیونکہ اس دن میں نے جب اسے اسٹاپ پر دیکھا، تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ تو پہلے سے میری دھندلی سی یادوں میں موجود تھا۔ ہر اس بس اسٹاپ پر جہاں لڑکیاں بس سے اترتی اور چڑھتی ہوں، ایسے لڑکے اکثر موجود ہوتے ہیں۔ وہ بس سے اترنے والی لڑکیوں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں خوش آمدید کہتے ہیں اور بس پر چڑھنے والی لڑکیوں کو الوداعی پراسرار خاموشی سے تکتے رہتے ہیں جیسے پھر ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوگی مجھے ان لڑکوں پر کبھی غصہ نہیں آیا تھا۔ یوں بھی گھر سے دفتر تک اور دفتر سے گھر تک آنے جانے میں ہجوم میں کھو کر ہجوم کو اپنے اندر گم کر لیتا ہوں۔ کبھی کبھار مجھے ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جیسے میں موم کے پتلوں کے درمیان چل رہا ہوں اور میرے سوا کوئی بھی زندہ نہ ہو۔

اس دن بس اسٹاپ پر اسے کھڑا دیکھ کر میں ذرا سا چونک گیا۔ بس سے لڑکیاں اتر رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ انھیں دیکھ رہا تھا۔ ایک لڑکا بس کے اندر جانے کے لئے عورتوں والے دروازے کی طرف بڑھا تو اس نے کہا "بھائی صاحب یہ لیڈیز گیٹ ہے"۔

"دوسرے گیٹ پر بہت رش ہے۔" اس لڑکے نے جواب دیا۔
"اپنی باری کا انتظار کیجئے۔"

اس اثنا میں ایک لڑکی پائدان پہ پاؤں رکھ کر ٹھٹک گئی۔
"بھائی صاحب! آگے سے ہٹ جائیے۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "دیکھتے نہیں آپ لیڈیز اتر رہی ہیں؟"
لڑکے نے اسے گھور کر دیکھا اور وہاں سے ہٹ کر مردوں کی قطار میں شامل ہو گیا۔

جب لڑکی بس سے اتر گئی اور وہ لڑکا مردوں کی صف میں شامل ہو گیا تو اس نے ایک لمبا سا سانس کھینچ کر چھاتی پھیلائی اور مسکرایا جیسے اس نے کوئی بڑا معرکہ مار لیا ہو۔ مردوں کی قطار میں دھکے کھاتے ہوئے لڑکے نے گھوم کر ایک جلی بھنی نگاہ اس پر ڈالی جیسے کہہ رہا ہو "بچہ! کبھی دیکھوں گا تمہیں"۔

ایک عرصہ گذر گیا اور میری اس سے مڈبھیڑ نہ ہوئی۔
یوں بھی مجھے اس سے کوئی تعلق خاطر پیدا نہ ہوا تھا۔ اس کی شوالری CHIVALRY نے مجھے کچھ زیادہ متاثر بھی نہ کیا تھا۔ میں پاکستان میں غیر ملکی ہپیوں کو دیکھ کر کبھی جز بز بھی نہیں ہوا تھا، نہ مجھے نیم پختہ پاکستانی ہپی ہی کچھ عجیب نظر آئے تھے البتہ اپنے ملک میں باقاعدہ ہپی ازم کا مجھے کوئی معاشی جواز نظر نہیں آتا تھا جہاں تک عام دنیاوی آرام و آسائش کے نقدان کا تعلق ہے، پاکستان کے اسی فیصد افراد عملی طور پر ہپی ہیں۔ غیر ملکی ہپی اپنے معاشرے کی کثرت آسائش کے مریض ہیں اور محرومی کو روحانی سرور کے لئے اختیار کرتے ہیں۔

پھر ایک دن گرمیوں کی ایک سخت دوپہر کو جب میں بس اسٹاپ کے نیچے پناہ لینے کے لئے لپکا تو شیڈ سے باہر میری اس سے ملاقات

ہو گئی۔ عینک کے پتے ہوئے شیشوں کے پیچھے میری چندھیائی ہوئی آنکھیں بھی پسینے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس موسم اور اس حالت میں اس سے ملاقات میرے لئے کسی خوشی کا باعث کیا ہو سکتی تھی۔ میں شیڈ کے مردانہ حصے میں پناہ گزین ہو گیا۔ شیڈ کی ٹین کی نیچی چھت کا سایہ بھی تنور میں جھلسا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

میں تھکا ہوا تھا۔ اس لئے بینچ پر اس بس کے انتظار میں بیٹھ گیا جو گرم حمام بن کر آنے والی تھی اور اسٹاپ سے گھر تک بھاپ کے غسل کا تصور ابھی سے مجھے پسینہ پسینہ کئے ہوئے تھا کہ وہ میرے پاس آیا۔ اس نے کسی تمہید یا سلام کے بغیر کہا "آپ کے پاس ایک روپیہ ہو گا؟"

"ایک روپیہ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں اپنے لئے نہیں مانگ رہا جناب۔" اس نے ذرا چڑ کر کہا۔

"میں نہیں سمجھا۔"

"ذرا ادھر آیئے۔ لیڈیز شیڈ میں۔"

میں اپنی جگہ سے ہلنے کو تیار نہ تھا۔ لہٰذا میں نے چپکے سے ایک روپیہ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اس نے مجھے جن نگاہوں سے دیکھا۔ ان میں تشکر کی کوئی رمق نہیں تھی۔ مجھے اس پر نہیں، اپنے آپ پر غصہ آیا۔ وہ روپیہ لے کر سڑک پار کر گیا۔ اس نے ایک کار سے سیون اپ کی ایک بوتل لی اور لپک کر لوٹ آیا۔ وہ شیڈ کے زنانہ حصے کی طرف بڑھا تو تجسس مجھے بھی اس طرف کھینچ لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ بینچ کے ایک کونے پر ایک غیر ملکی ہپی لڑکی ڈھیر ہے، میلا پھٹا ہوا لباس، آنکھیں مندی ہوئیں۔ تانبے کی طرح جلے ہوئے سرخ چہرے پر پسینہ اور سوکھے ہوئے ہونٹوں پر پپڑیاں۔ وہ لڑکی لو اور دھوپ سے نڈھال ہو کر نجانے کب سے نیم بے ہوش تھی۔

اس نے کہا (ڈورلک)

لڑکی نے آنکھیں نہ کھولیں تو بار بار اس لفظ کو دہرایا۔ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ ان خالی خولی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی تھی۔ اس نے لڑکی کے منہ سے بوتل لگا دی۔ بوتل کے خنک لمس پر اس کے سوکھے ہونٹ کھلے اور اس نے بوتل کانپتے ہاتھوں میں تھام لی۔ پانی چھلکا اور اس کے ہونٹ تر ہو گئے۔ غٹ غٹ بوتل پی کر اس نے ہمیں ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "تمہیں کیا حق حاصل تھا کہ مجھے خواہ مخواہ پریشان کیا۔" میں نے ندامت سے آنکھیں جھکا لیں۔ لڑکے نے جھک کر لڑکی کے قدموں میں پڑی کھجور کی پنکھیا اٹھائی اور اسے ہوا کرنے لگا۔ لڑکی نے اس پر ایک بیزار سی نظر ڈال کر آنکھیں موند لیں۔

اس "نا" میں زندگی کے ڈرامے کا نقطۂ عروج پوشیدہ تھا جو بیک وقت ایک المیہ بھی تھا اور فارس (FARCE) بھی۔ ایک "نا" نے ایک شخص کی شولری اور دوسرے کی تمنائے تشکر کو کتنے مضحکہ خیز اور المناک انداز میں رد کر دیا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس سے آنکھیں نہ ملائیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس لڑکی سے پوچھوں کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے، اس کی انگریزی اس کی شولری کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ میں اب اس کی کوئی مدد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بے بس ہو کر پکار اٹھا "وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔" لڑکی نے آنکھیں نہ کھولیں۔

"یو۔ وہیر۔ گو۔ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے؟"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے لڑکی کا کندھا ہلا کر کہا۔ "وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔"

"نا۔"

گہری وادیوں سے نکلی ہوئی اس جھلائی ہوئی "نا" میں کچھ ایسی

بس میں چڑھتی اترتی ہیں۔ آج سواریوں میں لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ تھی۔ ایک پہلوان قسم کے لڑکے کو جس نے ایک لڑکی کے ساتھ کندھا ملا کر دروازے کی طرف بڑھنا چاہا تھا، اس نے بازو سے پکڑ لیا۔

"بھائی صاحب! شرافت بھی کوئی چیز ہے۔"

وہ لڑکا حیران ہوا۔ جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس نے شرارت سے کندھا نہیں ملایا تھا۔ بس پر سوار ہونے کی جلدی اور افراتفری میں ایسا ہو جاتا ہے۔ لیکن ہپی صاحب پر اصلاح اخلاق کے جنون کا شدید دورہ پڑا ہوا تھا وہ ذرا سی رعایت دینے کو بھی تیار نہ تھے۔

"تو شرافت کا ٹھیکیدار ہے۔" پہلوان نے اس کا بازو جھٹک کر کہا۔

"ماماں ہیرو دا۔"

"شٹ اپ" ہپی نے کہا۔

اس نے ہپی کے گریبان پر ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ ایک تل چانولی داڑھی والے بزرگ نے آگے بڑھ کر کہا "اماں! کیا کرتے ہو؟"

"میں اس کو مزہ چکھاؤں گا۔"

"نہیں برخوردار! یہ تو خدائی فوجدار ہیں۔ ان کی بات کا برا نہ مانو۔"

"میں اس آوارہ گرد کی گردن توڑ دوں گا۔ ہپی بنا پھرتا ہے سالا۔"

"اماں! اب غصہ تھوک بھی دیجئے۔"

"میں اسے جانتا ہوں جتنے پانی میں ہے۔ میرے ہی محلے کا تو رہنے والا ہے بھی۔"

"میں بھی انھیں جانتا ہوں۔ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہیں یوں ان کی نیت میں کچھ خرابی نہیں تھی۔"

پہلوان لڑکے نے اس کا گریبان چھوڑ دیا اور بس میں سوار ہو گیا۔

بزرگوار بس میں میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

"دیکھئے صاحب! اس نئی نسل کو کیا ہو گیا ہے۔ آج تو یقیناً خون خرابہ ہو جاتا۔" ان کی آواز میں فخریہ خوشی کی کھنک تھی۔

"جی ہاں۔ اس نے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا۔ پھر میں کیا کرتا، ڈیم فول۔"

"ڈیم فول کون؟" تل چانولی داڑھی والے حضرات نے پوچھا۔

"وہی شیدا۔" اس نے جلوس کا موڈ ہی بدل دیا۔

"میں بیچ میں نہ پڑتا تو۔۔۔۔۔"

"آپ نے اچھا کیا۔" میں نے ان سے پیچھا چھڑانے کے انداز میں کہا۔

میں بڑا اچھا سامع ہوں لیکن تپسی ہوئی بس میں کسی لمبے لیکچر کے سننے سے گھبرا رہا تھا کیونکہ تل چانولی داڑھی اور پیک سے بھرے ہوئے منہ والے لوگ جو بالخصوص ابھی ابھی نیکی کے کام میں کامیاب ہوئے ہوں جب اصلاح اخلاق کے موضوع پر تقریر شروع کر دیں تو میرے صبر کا پیمانہ بہت جلد لبریز ہو جاتا ہے نہ جانے کیوں؟

ایک صبح جب میں بس سے اتر کر کچہری کے پاس سے گزر رہا تھا تو میں نے اس ہپی کو دیکھا کہ اس کی ایک کلائی میں ہتھکڑی تھی۔ ایک سپاہی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں اس کے پاس سے گزرا تو ہپی نے مجھ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ خالی خالی آنکھوں میں پہچان کی کوئی رمق نہیں تھی میں جانتا تھا کہ میں بھی ساری انسانیت کی طرح کبھی اس کی توجہ کا مرکز نہیں رہا تھا۔ ہپی ازم کے فلسفے میں شاید اپنی ذات کی نفی سے زیادہ

دوسروں کے وجود کی نفی پر زور دیا جاتا ہے لیکن وہ تو من گھڑت پاکستانی ہپی تھا۔ میں نے اس کے ساتھ فلسفے کی نسبت خواہ مخواہ جوڑ دی تھی۔ صرف اتنی بات سچ تھی کہ اتنی ملاقاتوں کے بعد بھی میری ذات کا کوئی نقش اس کے ذہن میں قائم نہیں ہوا تھا۔ اس کے پتھریلے چہرے پر مجھے کسی جذبے کی جھلک نظر نہ آئی تھی اسے ہتھکڑی لگنے کا بھی افسوس نہیں تھا۔ اسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ انسانوں کے اتنے بڑے ہجوم میں اس وقت وہ ایک خاص انفرادیت کا حامل ہے کیونکہ وہ ایک نئے تجربے کے عمل سے گزر رہا ہے اس کے باوجود کہ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگی تھی اور اس کا کوئی موہوم فعل میزان عدل پر تلنے والا تھا، مجھے یقین تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ وہ رات کو فٹ پاتھ پر سو گیا ہوگا اور پولیس نے اسے آوارہ گردی کے الزام میں دھر لیا ہوگا یا بس اسٹاپ پر اس کی مسلسل موجودگی کسی سفید کپڑوں میں ملبوس پولیس مین کی کارگزاری کا نشانہ بن گئی ہوگی۔ میں نے تحقیق نہ کی۔ اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔

تب ملک میں ہنگاموں کا دور شروع ہوگیا۔

ابھی ابھی پیرس میں یونیسکو کی طرف سے بلایا ہوا وہ سیمینار ختم ہوا تھا جس میں دنیا بھر کے دانشوروں نے اس مسئلے پر غور کرنے کیلئے شرکت کی تھی کہ نوجوانوں میں (بالخصوص طلباء میں) حالیہ بے چینی کے اسباب کیا ہیں۔ میں نے بھی اخبارات میں ایک دو فاضلانہ مضامین پڑھے تھے اور لفظوں کے طومار سے صرف ایک دو کام کی باتیں اخذ کر سکا تھا اور وہ یہ تھیں کہ جن اسباب کی نشاندہی ہوئی ہے وہ میرے ملک میں موجود نہیں اور مذہب و اخلاق کی جو گرفت مغرب میں ڈھیلی پڑ گئی ہے وہ مشرق میں بدستور موجود ہے کیونکہ مشرق ابھی مشینی دور کی بھرپور لپیٹ میں نہیں آیا۔ میرا خیال تھا کہ نیویارک، لندن اور پیرس میں جنم لینے والے اضطراب کی یہ لہر سات سمندر پار نہ کر سکے گی۔

میں اب بھی نہیں کہہ سکتا کہ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا ہے۔

تاہم میں نے جن ہنگاموں سے بزعم خود محض فیشن سمجھ کر اغماض برتنا چاہا تھا، شدت اختیار کر گئے تو مجھے دھچکا سا لگا۔ جب سڑکوں پر مظاہرے شروع ہوئے تو میں نے دل گرفتگی سی محسوس کی۔ جیسے وقت سے پہلے کسی دھماکے نے مجھے گہری اور بوجھل نیند سے بیدار کر دیا ہو۔

لیکن میں نے ایک دن اس ہپی کو بس اسٹاپ پر دیکھا تو میں کچھ حیران سا ہو گیا۔ اسکول اور کالج بند تھے۔ بس اسٹاپ پر کوئی رونق نہیں تھی اس کی یہاں موجودگی مجھے بے حد بے معنی سی محسوس ہوئی۔ مجھے اس کے سپاٹ چہرے پر کوئی جذبہ نظر نہ آیا۔ کم از کم اسے کچھ مایوس سا تو نظر آنا چاہیئے تھا کیونکہ اس کی خدائی فوجداری کے مواقع ختم ہو گئے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے بھی اسی بس اسٹاپ پر آج اپنا افسانہ ختم کر دینے کا جواز مل جاتا۔

میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔

میں نے اسے ایک دن دیکھا کہ وہ سڑک پر ایک جلوس کی قیادت کر رہا ہے۔ اس جلوس میں گلیوں کے چھوٹے چھوٹے بچے شامل تھے۔ میلے کچیلے بچے جنھیں اخبار میں سٹریٹ ارچنز کا نام دیا جاتا تھا۔ یہ جلوس اتنا غیر اہم سا تھا کہ پولیس نے بھی اسے قابل اعتنا نہ سمجھا تھا۔ میں بھی اس پر بے تعلق سی ایک نگاہ ڈال کر گذر جاتا، اگر وہ ہپی مجھے ایک نظر نہ دیکھ لیتا۔ میں نے دیکھا کہ آج وہ بڑا خوش ہے۔ میں ایک دو لمحوں کے لئے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ یا شاید میری حیرت اسے قابل توجہ محسوس ہوئی تھی کیونکہ اس نے میرے قریب پہنچ کر ایک زور کا نعرہ لگایا۔ "انقلاب زندہ باد" اور میں کچھ سٹپٹا گیا۔

جلوس گذر گیا تو مجھے کچھ افسوس سا محسوس ہوا۔ میں اپنے اس جذباتی ردعمل کی وضاحت نہیں کر سکتا میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اب وہ ہپی نہیں رہا تھا کیونکہ ہپی لیڈر نہیں بنتے۔ اس کی شخصیت میں یہ تبدیلی کچھ اس قسم کی تھی جیسے ڈرائنگ روم کی دیوار سے کوئی مانوس پرانی تصویر کو اتار کر اس کی جگہ نئی تصویر لگا دی گئی ہو اور کمرے کی فضا بدل گئی ہو۔

دوسری بار میں نے اسے ایک بہت بڑے جلوس میں شامل دیکھا۔ وہ ایک پہلوان قسم کے نوجوان کے کندھوں پر سوار تھا۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر ایک نعرہ لگاتا جسے میں یہاں نہیں دہراؤں گا اور جلوس کا ایک حصہ اس کے نعرے کے جواب میں آسمان سر پر اٹھا لیتا تھا۔ یہ منظر مجھے بہت مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ لحیم شحیم کندھوں پر ایک مغنی آدمی سوار ہو

تو ہنسی آ ہی جاتی ہے۔ جلوس کے گزرنے کے بعد کونجتی ہوئی سڑک پر یہ تصویر دیر تک میری آنکھوں کے سامنے رہی اور میں اس تصویر کو یادوں کے چوکھٹے میں جمانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ تصویر کسی اور تصویر سے گڈمڈ ہوگئی ہے۔ چند لمحوں کی کشمکش کے بعد بھی میں دونوں تصویروں کو جدا جدا نہ کر سکا تو میں نے قدم بڑھا لئے۔

ایک صاحب نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا

"اجی حضرت! یہ کیا مذاق ہے؟"

"جی... جی..." میں نے چونک کر کہا۔

"ساری قوم جنون میں مبتلا ہوگئی ہے صاحب! زندگی جلسے جلوسوں میں گزر گئی ہے پر صاحب! ایسے منظر کبھی نہیں دیکھے تھے جلوس میں بھی تو کچھ شان ہوتی ہے۔"

"جی ہاں! جی ہاں!" میں نے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا۔

"آپ نے انھیں پہچانا؟"

"کن کو؟"

"وہی جو پہلوان جی کے کندھوں پر سوار تھے۔"

"میں نے سوچا کہ ہاں صاحب! میں نے انھیں پہچان لیا تھا اور ابھی ابھی آپ کو بھی۔ آپ وہی بس اسٹاپ والے بزرگ ہیں نا جنھوں نے ایک دفعہ ان کی خدائی فوجداری کی لاج رکھ لی تھی۔"

"وہی خدائی فوجدار۔ پر صاحب! عجیب بات تو یہ تھی کہ وہ انھیں پہلوان صاحب کے کندھوں پر سوار تھے جن سے ایک بار ان کی جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔" دونوں تصویریں کھٹ سے جدا ہو کر اپنے اپنے چوکھٹوں میں سما گئیں۔

"اماں! کتنا بڑا انقلاب ہے! دشمن دوست بن گئے۔ آئیے آپ بھی بس اسٹاپ پر چلیں گے نا!"

"جی ہاں!"

بس اسٹاپ پر ویرانی چھائی تھی۔

میں یکایک بہت اداس ہوگیا۔ تل چانولی داڑھی والے بزرگ پان کی پیک میں سے مسلسل باتیں کر رہے تھے اور میں خاموش تھا تاہم ان کی موجودگی غنیمت تھی ورنہ خالی خالی سنسان بس اسٹاپ کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ ہم کھڑے کھڑے تھک گئے تو شیڈ کے نیچے آکر بیٹھ گئے پھر میں اونگھ گیا جب میری آنکھ کھلی تو دھوپ پھیکی پڑ چکی تھی۔ اور میرے ساتھی مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"معلوم ہوتا ہے میں ذرا اونگھ گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ذرا اونگھ گئے تھے آپ؟ اجی حضرت! آپ تو باقاعدہ گھوڑے بیچ کر سوئے رہے۔"

"بس ابھی نہیں آئی؟" میں نے بے معنی سا سوال کیا۔

"جی نہیں اور نہ آنے کی توقع ہے۔"

تو پھر تانگہ لینا پڑے گا۔"

"دہلی دروازے تک بندہ بھی آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔"

"ضرور، ضرور، بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"چوٹ تو آپ کو بھی لگی ہے؟" میں نے پوچھا
وہ، میں تو اینگری فیل کر رہا تھا۔ کچھ بلائنڈ
سا ہوگیا تھا۔ ایک کھمبے سے ٹکرا گیا تھا۔

ہم اس اسٹاپ سے ذرا ہٹے ہی تھے۔ کہ انھوں نے کہا

"وہ آرہے ہیں۔"

"کون ؟"

"اجی وہی ! خدائی فوجدار صاحب۔ ذرا رک جائیے۔ ان کی مزاج پرسی تو کرلیں۔"

مجھے بھی گھر جانے کی کچھ جلدی نہ تھی۔ میں رک گیا۔

وہ قریب آیا تو میرے ساتھی بولے "اماں ! آج آپ نے بس اسٹاپ پر آنے کی زحمت یونہی گوارا کی۔ کہئے مزاج تو بخیر ہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے سپاٹ چہرے پر اس خوش آمدید

تب اُن کی نگاہ میلی چیکٹ پٹی پر جم گئی۔ یہ پٹی پیشانی کے عین درمیان میں کچھ زیادہ سُرخ نظر آرہی تھی۔

نے کوئی گداز بھی نہ پیدا کیا۔

"میاں آج آپ کو جلوس میں دیکھا تھا۔"

اس کے چہرے پر اس بات کا بھی کوئی اثر ظاہر نہ ہوا البتہ اس کی آنکھیں ذرا دیر کو جگنو کی طرح ٹمٹما گئیں۔

"پہلوان جی کے کندھوں پر سوار تھے آپ۔ اب تو باقاعدہ لیڈر بن گئے ہیں آپ ؟" اس کی آنکھوں کی چمک ذرا اور نکھر آئی تل چانولی داڑھی والے حضرت کا ایک تیر تو ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے میں نے سوچا۔

"آپ بڑی شان سے پہلوان جی کے کندھوں پر براجمان تھے۔ کیا تمکنت تھی بھائی ؟" انہوں نے میری طرف متوجہ ہو کر ایک آنکھ ذرا سی ٹیڑھی کی۔ بڑے میاں مذاق کے موڈ میں تھے میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ تب ان کی نگاہ میلی چیکٹ پٹی پر جم گئی۔ یہ پٹی پیشانی کے عین درمیان میں کچھ زیادہ سرخ نظر آرہی تھی۔

"جلوس خیریت سے گزر گیا ؟" ان کی آواز میں خوف کی خفیف سی لرزش بھی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"پہلوان جی کا جوش و خروش تو دیدنی تھا۔"

"وہ تو خواہ مخواہ جلوس میں آ شامل ہوا۔" اس نے پہلی بار بات کی۔

"خواہ مخواہ ؟" میں نے دہرایا۔

"آج منہ اندھیرے سے میں جلوس کے لئے لڑکوں کو اکٹھا کرتا رہا۔ جب بڑا جلوس آیا تو میں اپنے گروپ کو لے کر اس میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ تو بعد میں آیا۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

مجھے اس سے کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی۔

میں نے پوچھا "وہ بن بلائے آگیا ؟"

"جی ہاں ! اس نے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا۔ پھر میں کیا کرتا۔ ڈیم فول۔"

"ڈیم فول کون ؟" تل چانولی داڑھی والے حضرت نے پوچھا۔

"وہی شیدا۔ اس نے جلوس کا موڈ ہی بدل دیا۔"

"جلوس کو کیا ہوا ؟" میں نے جلدی سے پوچھ لیا۔

"چوک پر ہمارے والا گروپ راڈ ڈمی ہو گیا اسے روک لیا گیا۔"

"پھر آپ نے جلوس کو پرامن طور پر منتشر کر دیا ہو گا ہیں نے پوچھا"

"نہیں جی ! ہم پر لاٹھی چارج ہوا۔"

"چچ .... چچ ...." تل چانولی داڑھی والے حضرت نے اظہار افسوس کیا "آپ کو چوٹ وٹ تو نہیں لگی ؟"

"لڑکے گلیوں میں بھاگ گئے۔"

"شیدا بھی بھاگ گیا ہو گا ؟" میرے ساتھی نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

"آپ میدان میں اکیلے رہ گئے ہوں گے ؟"

"جی... شیدا بھی تھا۔ وہ بھاگا نہیں تھا۔ ایک پولیس مین نے لاٹھی مجھے مارنی چاہی تھی۔"

"اوہو... ہو ...."

"شیدے نے دھکا دے کر مجھے ایک طرف کو ہٹا دیا۔
ڈیم فول۔ اڈیٹ۔"

میرے ساتھی نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ پھر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ بولے "میاں اچھا ہوا کہ آپ بچ گئے۔"

اس نے میرے ساتھی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"وہ لاٹھی تو مجھے لگنی چاہئے تھے جی!"

"عجیب بات ہے" میرے ساتھی نے میری طرف پھر حیران نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔

"اجی حضرت! میں نے کیا کہا بھلا؟ میری کون سی بات ناگوار گذری آپ کو؟" میرے ساتھی نے لرزتی ہوئی آواز میں غصے کا اظہار کرنا چاہا۔ یہ اظہار اتنا مضحکہ خیز تھا کہ میں نے قہقہہ پیٹ میں دبا لیا۔ پیٹ میں بل پڑنے لگے۔

"جلوس کے لئے لڑکوں کو میں اکٹھا کرتا رہا۔ لیڈر وہ سالا بن گیا؟ اب اس کا خون سڑک پر بہے گا۔ لوگ وہاں پھول چڑھائیں گے۔ پوسٹر لگائیں گے۔ شیدا۔ ڈیم فول۔ اڈیٹ۔ خواہ مخواہ زندہ باد ہو گیا وہ۔"

میں بڑا اچھا سامع ہوں۔

لیکن پتی ہوئی بس میں کسی لمبے لیکچر کے سننے سے گھبرا رہا تھا کیونکہ تل چاولی ڈاڑھی اور پیک سے بھرے ہوئے منہ والے لوگ جو بالخصوص ابھی ابھی نیکی کے کام میں کامیاب ہوئے ہوں تو جب اصلاح اخلاق کے موضوع پر تقریر شروع کر دیں تو میرے صبر کا پیمانہ بہت جلد لبریز ہو جاتا ہے۔

"لاٹھی شیدا کے سر پر لگی وہ ڈھیر ہو گیا۔ اڈیٹ۔ ڈیم فول۔"

"لیکن آپ . . . ؟"

"میں کیا کرتا جی؟ میں بھی گر پڑا تھا۔ کسی پولیس مین نے میری طرف توجہ نہ کی۔ جیسے میں نے جلوس کو لیڈ نہیں کیا تھا، اس نے کیا تھا۔ بڑا سیلی فش نکلا سالا!"

"اماں! اس میں خود غرضی کی کیا بات تھی؟ اس نے آپ کی جان بچا دی۔"

"شٹ اپ"

میرے ساتھی دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"ڈیم فول۔ اڈیٹ"

"چوٹ تو آپ کو بھی لگی ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ میں تو اینگری فیل کر رہا تھا۔ کچھ بلائنڈ سا ہو گیا تھا۔ ایک کھمبے سے ٹکرا گیا تھا۔"

اب میں قہقہے کو پیٹ میں اور زیادہ دبا نہیں سکتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ ذرا دور جا کر میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"ڈیم فول۔ اڈیٹ . . . ." تل چاولی داڑھی والے حضرت نے کہا

"کون؟" میں نے پوچھا۔

"کون؟" انھوں نے غصے سے بھری لال لال آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے میرا ہی سوال میرے منہ پر پھینک دیا۔

SCANNED BY
OFFICES OF
AMIN H. KARIM
MD

بتیس روپے

۲۸ نومبر ۱۹۷۰ء

محترمی صداقت چوہدری

اسلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

یاد آوری کا شکریہ۔ "نمود سحر" کے لئے ایک افسانہ "بتیس روپے" ارسال کر رہی ہوں۔ یہ سچا واقعہ ہے۔ جسے افسانے کا روپ دیا گیا ہے۔ اگر آپ شائع کر دیں تو یہ آپ کی بڑی جرأت ہوگی۔ دعاؤں کے ساتھ۔

مخلص

رضیہ بٹ

محترمہ رضیہ بٹ صاحبہ

اچھے بڑے لوگ آپ کو زندگی میں ہر موڑ پر ملیں گے "اکائی" "کل" کی نمائندہ نہیں ہو سکتی۔ میڈیکل پروفیشن سے متعلق لوگوں کی واضح اکثریت اتنی باشعور ہے کہ وہ آئینے کو توڑنے کی بجائے چہرے کی دھول صاف کرنا پسند کرتی ہے۔

مدیر اعلیٰ

[redacted]

رضیہ بٹ

[redacted]

ٹرن ٹرارن۔ ٹن ٹن۔ ٹرارن۔ ٹررر۔

دروازے کی گھنٹی بجی اور پھر مسلسل بجتی ہی گئی۔

ڈاکٹر ظہیر اپنے نئے مکان کی دوسری منزل کے پہلے کمرے میں سو رہا تھا۔ رات کے دو بجے تھے اور اسے سوئے ابھی بمشکل ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا۔ رات بارہ بجے بیگم ہاشم کا فون آیا تھا۔ اس کے شوہر کے سر کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ ظہیر اس کا معالج تھا۔ تھکاوٹ کے باوجود اسے دیکھنے جانا تھا۔ بیگم ہاشم نے گاڑی بھی بھیج دی تھی۔ گھڑی بھر میں بتیس روپے کھرے تھے۔ ظہیر اس مالدار آسامی کے لئے یہ تکلیف برداشت کرنے کو تیار تھا۔

اس کی تکلیف بالکل معمولی نوعیت کی تھی پھر بھی اس نے تسلی کے لئے نسخہ بدل دیا۔ اور پہلے سے قیمتی دوائیاں تجویز کر دیں۔ بیگم ہاشم نے زبردستی کافی پلانے کو روک لیا یوں وہ ایک بجے فارغ ہو کر

گھر لوٹا۔ اور بستر پر پڑتے ہی گہری نیند کے مزے لینے لگا۔

ڈاکٹر ظہیر اپنے علاقہ کا جانا پہچانا ڈاکٹر تھا۔ کچھ عرصہ ہسپتال میں نوکری کی تھی۔ لیکن اخراجات کے بڑھتے تقاضے معمولی تنخواہ کے متحمل نہ تھے۔ ۔ نہ ہی اس آمدنی سے سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے اپنے پیشے کے شایانِ شایاں معیار زندگی برقرار رکھا جا سکتا تھا۔ اس نے نوکری چھوڑ پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی تھی۔ اور اب تو اس کی دکان خوب چل نکلی تھی۔ اس نے اپنی فیس میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ پانچ سے دس اور دس سے سولہ اور اب رات کسی دیکھنے کو جاتا تو بتیس روپے فیس کے علاوہ سواری کا خرچہ بھی لیا کرتا۔ اور یوں چند ہی سالوں میں اس نے اتنا روپیہ کما لیا کہ اپنا مکان بنا لیا۔ جس کی نچلی منزل پر کلینک بھی بنوا لیا۔

وہ صبح سے شام تک مریضوں کو دیکھتا۔ کسی کے گھر جانے کی ضرورت پڑتی تو وہ وہاں بھی جاتا رات وہ جب کلینک سے فارغ ہو کر اوپر آتا تو اس کی جیبیں نوٹوں اور ریزگاری سے بھری ہوتیں۔

آج بھی مریضوں کا تانتا بندھا رہا تھا۔ تین مریضوں کو گھر دیکھنے گیا تھا اور رات ہاشم کی کوٹھی جانا ہو گیا تھا۔ وہ تھک تو بہت گیا تھا لیکن پیسوں کا خمار گہری نیند کا ضامن تھا۔

دروازے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ آج بیگم بھی میکے گئی تھی! اور بوڑھا ملازم بھی چھٹی پر تھا۔ غنودگی میں اس نے آواز سنی اور پھر بے سدھ ہو گیا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اب گھنٹی کی بجائے دروازہ زور زور سے پیٹا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ کوئی چیخ چیخ کر اسے پکار رہا تھا۔ ڈاکٹر جی ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر جی۔ بڑبڑاتے ہوئے وہ بستر سے نکلا۔ آنکھیں ملتے ہوئے بتی جلائی اور پھر گلی میں نکلنے والی کھڑکی سے باہر جھانکا۔

گلی میں کمیٹی کی بتی جل رہی تھی ظہیر نے اس کی روشنی میں دیکھا۔ ایک خستہ حال عورت سینہ پکڑے کھڑی "ڈاکٹر جی" "ڈاکٹر جی" کی رٹ لگا رہی تھی۔ پھٹے پرانے کپڑوں والا مرد دروازہ پیٹ رہا تھا۔ بالکل گنوار پنے سے

"کون ہے"۔ ظہیر کو ان کی بیہودگی پر غصہ آگیا۔

"ڈاکٹر جی میرا بچہ بیمار ہے۔ بڑا بیمار ہے۔ ڈاکٹر جی۔ اسے جلدی دیکھ لیں نہ ہائے اسے کچھ ہو گیا تو میں بھی مر جاؤں گی۔ وہ میرا ایک ہی بچہ ہے، ڈاکٹر جی میں بیوہ عورت ہوں۔ اس کے پیٹ میں سخت تکلیف ہے۔ وہ بڑا بیمار ہے ڈاکٹر جی"۔

"ہونہہ" ظہیر کا پارہ چڑھ گیا "انسانیت ہی نہیں رہی ان لوگوں میں"

"ڈاکٹر صاحب۔ اس مرد نے اوپر دیکھتے ہوئے عاجزی سے کہا۔

"یہ میری بہن ہے۔ اس کا اکلوتا جوان لڑکا سخت بیمار ہے"۔ خدا کے لئے چل کر اسے دیکھ لیجئے۔ آپ کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔ شاید وہ بچ جائے ڈاکٹر صاحب، خدا کے واسطے"۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ جوڑ کر گریہ وزاری کر رہے تھے۔ ظہیر کو نیند آرہی تھی۔ بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ان مفلوک الحال لوگوں کے ساتھ جانے کو وہ قطعاً تیار نہ تھا۔ اس کی فیس بتیس روپے تھی اور ان سے تو بتیس پیسے بھی ملنے کی توقع نہ تھی۔ ظہیر نے نفرت سے انہیں دیکھا۔ عورت رو کر اور مرد عجز و انکساری سے ڈاکٹر کو ساتھ چل کر مریض کی حالت دیکھنے کو کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں بدحواس ہو رہے تھے۔ پریشانی ان کے انداز سے مترشح تھی۔

"میں رات کو کوئی مریض دیکھنے نہیں جاتا مریض کو یہاں لے آؤ"۔ اس نے بالآخر کہا۔

"ڈاکٹر جی ___ اسمیں اتنی جان نہیں ہے کہ یہاں لایا جائے۔ آپ ہی تکلیف فرمائیں"۔

مرد بولا۔ غریبوں پر رحم کریں ___ ڈاکٹر جی"۔

عورت سینہ دونوں ہاتھ سے پیٹنے کے انداز میں فریادی تھی۔

"گھر چل کر دیکھ لو میرے بچے کو ___ اسے کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی۔ میرے گھر چلو ڈاکٹر جی"

"گھر جانے کی فیس بتیس روپے ہے"۔ ظہیر نے انتہائی کھٹور لہجے میں کہا۔

بتیس روپے کے جواب میں عورت اور مرد پر ایک سناٹا طاری تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے دونوں گڑگڑا کر ڈاکٹر سے کہہ رہے تھے "وہ سخت بیمار ہے۔ ڈاکٹر جی بتیس روپے ہمارے پاس نہیں ہیں۔ خدا واسطے کا کام ہے۔ ہم بہت غریب ہیں"۔

"میں بتیس روپے سے ایک پیسہ کم نہیں لونگا سمجھے۔ پیسے ہیں تو جا کر دیکھ آتا ہوں تمہارے لڑکے کو۔ نہیں ہیں تو جاؤ" ظہیر نے